ماہنامہ
بانی: غلام حیدر شیخ
برجستہ
چیف ایڈیٹر: اویس حیدر شیخ
لاہور اور کویت سے بیک وقت اشاعت
ONLINE EDITION
VOLUME: 4 | ISSUE 52 | JULY 2026
حسین منی و انا من حسین
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
یا حسین
راحتِ جانِ عالم
جگر گوشہ رسول ﷺ
حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

A Project By
ETIMAAD
PROPERTY NETWORK

ETIMAAD
SIGNATURE HOMES

3 MARLA HOME
3 YEARS INSTALLMENT PLAN

LOCATION: MAIN RAIWIND ROAD MARYAM TOWN

Booking	Digging on confirmation	Monthly Installment	2nd Slab	After 6 Momths	Possession	Total price
750,000	750,000	80,000	1,500,000	536,666	3,900,000	13,000,000

FACING 5 MARLA

Booking	Digging on confirmation	Monthly Installment	2nd Slab	After 6 Momths	Possession	Total price
750,000	750,000	93,000	1,500,000	536,666	3,932,000	13,500,000

03214449225

ISSN # : 3080-9746

ماہنامہ
برجستہ
لاہور اور کویت سے بیک وقت اشاعت

سرورق		فرنٹ
اشتہار		صفحہ 2
فہرست		صفحہ 3
اداریہ	بچوں کا تحفظ اوّلین ترجیح	صفحہ 4
کالم ومضامین	آج کا شہر کربلا کیسا؟	صفحہ 5
کالم ومضامین	امتحان، خواب اور حقیقت کی کشمکش	صفحہ 6
کالم ومضامین	شخصیت پرستی کی غلط روش اور اُس کے نتائج	صفحہ 7-8
کالم ومضامین	مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح	صفحہ 9-10
کالم ومضامین	افواہ سازی	صفحہ 11
کالم ومضامین	علم وآگہی کا کمال یہ ہے کہ آدمی یہ پہچان لے کہ کن باتوں کو اہمیت نہیں دینی	صفحہ 12
کالم ومضامین	نجی تعلیم: مسائل اور حقیقت	صفحہ 13-14
کالم ومضامین	روایتِ حیا، ارمغان سخا: سیرتِ عثمان ذوالنورین کے درخشاں زاویے۔۔۔۔حضرت عثمان غنیؓ	صفحہ 15-16
اشتہار		صفحہ 17
کالم ومضامین	ترکیہ میں اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش پھر شدت اختیار کر گئی۔۔۔۔ترکیہ کا نیا ڈرامہ زیر بحث	صفحہ 18-19
کالم ومضامین	اعتماد کا جنازہ	صفحہ 20
کویت ڈائری	کویت: پاک ڈونرز کا اعزاز۔۔۔سنٹرل بینک کویت کی تسلیم شدہ 10 سرکردہ تنظیموں میں تیسری پوزیشن	صفحہ 21
کویت ڈائری	کویت: Tastes of Pakistan سفارت خانہ میں تاریخی ثقافتی پروگرام کا انعقاد	صفحہ 22
انقرہ ڈائری	فتح استنبول، 20 مئی 1453ء ترک عثمانیوں کی عظمتِ رفتہ	صفحہ 23-24
ایک شاعر ایک تعارف	اِنتہائی نفیس شخصیت کے حامل معروف شاعر۔۔۔۔اختر شمار	صفحہ 25
طب وسائنس	گرمی دانے (پت)	صفحہ 26
اشتہار		صفحہ 27
دین حق	منشیات کی روک تھام کے عملی اقدامات	صفحہ 28
بچوں کی کہانیاں	ریچھ کا شکار	صفحہ 29
کھیل کھلاڑی	پاکستان کرکٹ ٹیم کا 10 واں دورہ ویسٹ انڈیز۔۔۔اُمیدیں اور حقائق	صفحہ 30
فلمی دُنیا	برصغیر کے Anti Heros جنہوں نے ہیروز سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی	صفحہ 31
اشتہار		صفحہ 32

اشتہارات کے لئے رابطہ کریں
+92-322-5300-703 FOR PAKISTAN
+965-6600-6571 FOR KUWAIT

ISSN # : 3080-9746

بچوں کا تحفظ اوّلین ترجیح

ہمارے ملک پاکستان میں بچوں، خصوصاً کمسن بچیوں کے ساتھ جنسی زیادتی، ہراسگی، اغواء اور تشدد ایک سنگین سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ ایسے جرائم نہ صرف متاثرہ بچوں کی جسمانی بلکہ ذہنی اور جذباتی صحت پر بھی دیرپا اثرات چھوڑ دیتے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں مختلف شہروں سے ایسے افسوسناک واقعات سامنے آ رہے ہیں۔ پاکستان میں بچوں کے تحفظ کے لئے اہم قوانین بنائے گئے ہیں جس میں جنسی زیادتی کے مقدمات کی فوری اور موثر تفتیش، فرانزک شواہد اور متاثرہ بچے یا بچی کی شناخت کو خفیہ رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا شامل ہیں، اگر کوئی بچہ یا بچی اغواء یا لاپتہ ہو جائے تو فوری الرٹ جاری کرنے اور تلاش کے لئے قومی نظام قائم کرنا شامل ہیں۔ جنسی زیادتی کے بنیادی اسباب جو دیکھنے میں آ رہے ہیں وہ غربت، جہالت، والدین کی کم آگاہی، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا غلط استعمال تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ مجرموں کو بروقت سزا نہ ملنا، بچوں کی مناسب نگرانی کا فقدان بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کو روکنا ایک دن کا کام نہیں۔ گھر، سکول، معاشرہ اور ریاست کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ گھر سب سے مضبوط جگہ ہے جہاں بچہ سب سے زیادہ وقت گزارتا ہے۔ گھر میں ماں باپ کو بچوں کو سادہ الفاظ میں سکھانا چاہیے کہ اگر کوئی چھونا تمہیں عجیب یا کنفیوژ کرے تو وہ بُرا ہے اور اسے ماں باپ کو فوری بتانا ہے۔ ماں باپ سے کوئی راز نہیں چھپانا اگر کوئی کہے کہ امی کو نہیں بتانا تو یہ خطرے کی نشانی ہے امی کو فوراً بتانا چاہیے۔ بچوں کو بتانا چاہیے کہ وہ کس کس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے جس میں ابو، امی، ٹیچر، خالہ ہی ایسے رشتے ہیں جو تمہارے اپنے ہیں جن سے سب باتیں شیئر کی جا سکتی ہیں۔

آج کل بچے بغیر کسی روک ٹوک کے انٹرنیٹ اور موبائل کے عادی ہو چکے ہیں وہ جب بھی کہیں بیٹھتے ہیں ان کا موبائل آن ہوتا ہے اور خاموشی سے انٹرنیٹ پر بُری اچھی موویز، ٹک ٹاک، انسٹا گرام، یوٹیوب دیکھ سکتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ماں باپ بچوں کو انٹرنیٹ اکیلے میں نہ دیکھنے دیں ان کے ساتھ بیٹھ کر یوٹیوب گیمز کھولیں پرائیویسی سیٹنگز آن رکھیں اور ان کی نگرانی ہر صورت کی جائے۔ عام طور پر بچے اپنے والدین سے ڈرتے ہیں اور ان سے اپنے دل کی بات نہیں کرتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید ہمارے ماں باپ اس بات سے نالاں ہو جائیں، مگر والدین کو بھی چاہیے کہ وہ بچے کی بات، شکایت کو غور سے سنیں اور کوئی بھی ردعمل نہ دیں بلکہ اس کے بتانے پر اسے شاباش دیں اور اس کی بات بتانے پر کہیں کہ تم نے اچھا کیا جو یہ بات ہم تک پہنچا دی۔ تم مشکل سے بچ گئے ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اس پر پورا اعتماد کریں اور اس کی ہمت بندھائیں تاکہ وہ ہمیشہ اپنا ہر راز اور بات آپ سے شیئر کرے۔

سکولوں میں آگاہی سیشن ہونا چاہیے اسے پورے ملک میں نافذ کرنا چاہیے۔ اساتذہ کو بھی اس کی ٹریننگ دی جائے کہ وہ بچے کے اشارے کیسے پہچانیں۔ سکولوں میں سی سی ٹی وی کیمرے لگائے جائیں، لیڈی اسٹاف اور کوئی استاد بچے سے اکیلے بند کمرے میں نہ ملے۔ مساجد، کمیونٹی سنٹرز اور میڈیا پر علماء، ڈاکٹرز سماجی کارکن مل کر والدین کو یقین دلائیں کہ رپورٹ کرنا بدنامی نہیں، بچانا ہے جب ماں، استاد، مولوی، پولیس اور پڑوسی سب ایک ساتھ مل کر کام کریں گے تب ہی ہم اپنے بچوں کو محفوظ بنا پائیں گے۔ ہمارے بچے اکثر کسی بھی اجنبی کے ساتھ گھر کے باہر گراؤنڈز میں کھیلنے لگتے ہیں ایسا کرنا بھی بعض اوقات بہت غلط ثابت ہوتا ہے۔ محلے کی سطح پر والدین کو چاہیے کہ پارکس، گلیوں اور ویگن ڈرائیورز پر نظر رکھیں۔ بچہ کسی بھی معاشرے کا مستقبل ہوتا ہے جب بچے غیر محفوظ ہوں گے اور اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کریں تو پورے معاشرے کی بنیادیں کمزور ہوں گی۔ پاکستان سمیت پوری دنیا میں بچوں کے ساتھ جسمانی، جذباتی اور جنسی زیادتی کے واقعات رپورٹ ہو رہے ہیں۔ یہ بہت حساس اور اہم موضوع ہے۔ بچوں کے ساتھ زیادتی کا بڑھتا ہوا رجحان ہم سب کے لئے تشویش کا باعث ہے۔ زیادتی کو اکثر صرف ایک زاویے سے دیکھا جاتا ہے جبکہ اس کی کئی شکلیں ہیں جسمانی زیادتی بچے کو مارنا زخمی کرنا، جذباتی زیادتی بچوں کو ڈرانا، دھمکانا، مسلسل بے عزت کرنا، نظر انداز کرنا، جنسی زیادتی بچے کا کسی بھی طرح جنسی استحصال اور غفلت جس میں بچے کی بنیادی ضروریات یعنی خوراک، تعلیم، صحت اور تحفظ کا خیال نہ رکھنا شامل ہیں۔ اگر ہم جنسی زیادتی کے پیچھے کارفرما عوامل کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی ایک کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں تربیت سے لے کر سماجی ڈھانچے کی خرابی کے عوامل موجود ہیں۔ اکثر ایسے مجرم نفسیاتی مریض ہوتے ہیں جو مختلف قسم کے جرائم میں بھی ملوث پائے جاتے ہیں۔ وہ جس سے زیادتی کر رہا ہوتا ہے اس کو بے بس دیکھتا ہے تو اسے راحت اور تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ مجرم انٹرنیٹ کا بلا روک ٹوک استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ غیر اخلاقی فلمیں اور فحش مواد دیکھ کر ذہنی بگاڑ کا شکار بھی ہو چکا ہوتا ہے اور انسانی تقدس اور احترام اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کچھ عرصہ پہلے اسی نفسیاتی بیماری میں ایک مجرم کو میو ہسپتال کی چھت سے پکڑا گیا تھا جہاں وہ ہر روز ایک معصوم بچی کو گوالمنڈی کے علاقے سے پکڑتا اس سے بدفعلی کرتا اور دوسرے دن اسی گلی میں چھوڑ جاتا۔ اس نے بتایا کہ وہ جب اپنے گاؤں سے لاہور آیا اور جو کمرہ کرایے پر لیا ہے وہاں رات کو سب کرایہ دار لڑکے جو یقیناً 16 سے 18 سال کے درمیان تھے گندی اور فحش فلمیں دیکھا کرتے جس کے نتیجے میں اس پر نفسیاتی طور پر غلط اثر ہوا اور وہ یہ کام کرنے لگا۔ ہمارے معاشرے کا بگڑنا اور رشتوں کے تقدس کا پامال ہونا خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس کے لئے وزیر اعلیٰ پنجاب سے درخواست ہے کہ قانون کو مزید سخت ہونا چاہیے۔ انصاف کے حصول میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے بلکہ مجرموں کو سرعام سخت اور کڑی سزائیں ملنا چاہئیں اگر ایک مجرم اپنے اثر و رسوخ سے بچ نکلے گا تو باقی مجرموں کا حوصلہ مزید بلند ہو جائے گا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف نے جہاں بہت سی اصلاحات پر توجہ دی ہے اس معاملے کو بھی ریاستی اور قانونی سطح پر سخت سے سخت قوانین نافذ کریں اور بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے درندوں کو عبرناک اور فوری سزائیں دی جائیں جب تک ہم قانون کی بالادستی اور بچوں کے تحفظ کو اپنی اولین ترجیح نہیں بنائیں گے اس وقت تک پاکیزہ معاشرہ ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔

بانی: غلام حیدر شیخ
ماہنامہ
برجستہ
چیف ایڈیٹر: اویس حیدر شیخ
لاہور اور کویت سے بیک وقت اشاعت

ہماری ٹیم

ایگزیکٹو ایڈیٹر: علی حیدر شیخ
ایڈیٹر: اصغر علی کھوکھر
مینجنگ ایڈیٹر: عدیل احمد خان
ڈپٹی ایڈیٹر: عائشہ خان
ریزیڈنٹ ایڈیٹر جدہ: امیر محمد خان
لیڈی ایڈیٹر (یو۔کے): ڈاکٹر رابعہ حیدر
ایڈیٹر کویت: محمد عمر
فوٹو گرافر: ذوالقرنین حیدر
مارکیٹنگ اینڈ سرکولیشن: معیز احمد

آج کا شہرِ کربلا کیسا؟

حضرت امام حسینؓ کا روضہ اطہر شہر کے وسط میں ایک چار دیواری کے اندر واقع ہے

اویس حیدر شیخ

یوں تو دنیا کے ہر خطہ پر مظلوموں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا، ہر بقعۂ زمین شہداء کے لہو سے لالہ زار بنا مگر حقیقت یہ ہے کہ کربلا کی مختصر سی زمین پر انسانی خون جس بے دردی کے ساتھ بہایا گیا عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہوگا کہ محض عاشورہ وہ روز تھا کہ جس دن عرصہ کربلا پر ظلم وجور کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ نہال بشریت پامال ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس سرزمین پر طلوع ہونے والے چاند وسورج نے نہ معلوم کتنی بار اس باغ کو اجڑتے دیکھا کہ جس کی آبیاری سید الشہداء حضرت امام حسینؓ نے اپنے خون تازہ سے کی تھی۔ حضرت امام عالی مقامؓ نے جس علَم کو اپنے بے بہا خون سے رنگ کر دُنیا کی ہدایت کے لئے زمینِ کربلا پر نصب کیا تھا اُس کو گرانے کے لئے یکے بعد دیگرے مسلسل ہاتھ اٹھے، اس کے مٹانے کی خاطر اس مقدس شہر کو متعدد بار آگ لگائی گئی، اس کو لوٹا گیا، اس کے بازاروں کو لاشوں سے پاٹا گیا، صحنِ اقدس میں خون کے دریا جاری کر دیئے مگر۔۔۔ کیا سرنگوں ہو گیا یہ علم؟ نابود ہو گیا یہ نشان؟ اس کا جواب تاریخ نے دیا کہ حق کے لئے ڈٹ جانے والے امر ہو جاتے ہیں۔ اوران کے نام سے کربلا بھی اپنے ہونے پہ ناز کرتا ہے۔

جی ہاں! وہی کربلا جہاں کبھی بنجر زمین تھی، اب وہاں چاروں طرف ہرے بھرے باغات ہیں جن کی وجہ سے تقریباً تمام سال قسم قسم کے میوے بازار میں دکھائی دیتے ہیں یہاں تک کہ مشہور ہو گیا ہے کہ عربستان بھر میں طائف وکربلا سے زائد پھل کہیں پیدا نہیں ہوتے۔ کربلا کے چاروں طرف کافی رقبہ میں دور تک انہی باغات کا سلسلہ چلا گیا ہے جن کی آبیاری آب فرات سے ہوتی ہے۔ یہ باغات وہاں سے گزرنے والوں کو بہت دور سے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ قریب ہو جانے پر ان کے مزار کے دونوں گنبد بھی نظر آتے ہیں، جس وقت دل میں ارمان زیارت لئے ہوئے ایک زائر پہلے پہل اس روح پرور منظر کو دیکھتا ہے تو اس کی وارفتگی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے یا اس کی کیفیت وہی لوگ جانتے ہیں جن پر خود گزر چکی ہے۔ ریل یا موٹر جب منزل سے قریب ہو اور ایک مرتبہ ہمراہی اشارہ کر دیں کہ ”وہ روضہ اقدس دکھائی دیا!“۔ اس آواز کو سنتے ہی دل پہ کیا گزرتی ہے، رعبِ حسن تو سنا ہی تھا لیکن یہاں رعب بیکسی ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی لیکن اشتیاقِ زیارت سے مجبور ہو کر حسرت آمیز ولولوں کو دل میں لئے ہوئے زائر بتانے والوں کے اشارے پر نظر کرتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ۔۔۔ چاند کو دیکھتے ہیں مگر۔۔۔ چاند کو دیکھ کر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، دل کا کنول کھل جاتا ہے اور یہاں!۔۔۔ جب گنبد پر نگاہ پڑتی ہے تو دل پر وہ چوٹ لگتی ہے کہ جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ درختہائے خرمہ کی آڑ میں سے دونوں روضے کچھ اس طرح مرقعہ حسرت بن کر دکھائی دیتے ہیں کہ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لاکھ ضبط کرو، دھیان ہٹاؤ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلیجہ منہ کو آ جائے گا۔ آخر کار اشکوں کا دریا آنکھوں سے اور نالہ وشیون کی آوازیں دہن سے نکلنے لگتی ہیں ۔ باغات سے گزرنے کے بعد اصل شہر ملتا ہے۔ پختہ سڑکیں، کئی منزلہ عمارتیں، سڑکوں پر برقی روشنی، پر آسائش گھر گویا کہ تمام وہ چیزیں موجود ہیں جو آجکل ایک متمدن شہر میں ہونی چاہئیں۔ دنیا بھر کے مختلف گوشوں سے زائرین یہاں آتے رہتے ہیں۔ یہ غیر ملکی زائرین ہر طرف نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے کربلا ایک اچھا خاصا شہر بن گیا ہے۔ جا بجا سجی ہوئی کشادہ دوکانیں موجود ہیں جن سے زائرین تبرکات سوغات خرید کر اپنے وطن لے جاتے ہیں۔

ایک چیز یہ خیال کرنے کے قابل ہے کہ جس طرح حضرت عباس بن علیؓ زندگی میں جناب سید الشہداء کے دربان تھے یعنی بغیر ان سے ملے امام عالی مقامؓ تک رسائی نہیں ہوتی تھی، اسی طرح اب بھی پہلے بھائی کے زائرین کا استقبال کرتے ہیں، کیونکہ اسٹیشن سے جو سڑک شہر آئی ہے وہ سیدھی حضرت ابوالفضل عباسؓ کے دروازہ پر پہنچ کر ختم ہوئی ہے۔ اس لئے ہر آنے والے کو پہلے چھوٹے بھائی کا مواجہہ کرنا پڑتا ہے۔ سڑک کے دو طرفہ خوشنما عمارتیں، آراستہ دکانیں دور تک چلی گئی ہیں۔ پھاٹک پر سرچ لائٹ کی قسم کا ایک بہت طاقتور برقی لیمپ نصب ہے، جس کی روشنی سے تا حد نا شاہراہ منور رہتی ہے۔ اندر جانے پر کشادہ صحن ملتا ہے۔ سقے صراحیاں لئے سبیل عطشان! سبیل عطشان! پکارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ روضے کا اگلا حصہ اور نصف مینار سونے کے ہیں۔ قبہ (گنبد نما) پر بھی سونا چڑھا دیا گیا ہے جو بہت خوبصورت ہے، حرم میں داخل ہونے پر دل میں عجیب رعب طاری ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل حضرت امام حسینؓ کے مزار اقدس پہ جانے کیلئے گئی گلیوں سے گزر کر جانا ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ کا روضہ اطہر شہر کے وسط میں ایک چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ وسط صحن میں خوبصورت اور بلند عمارت ہے جس کے اندر باہر ”پچکاری“ کی ہوئی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا عمارت سونے، چاندی، جواہرات، سنگ مرمر، شیشہ اور بلور سے بنی اور سجی ہوئی ہے۔ اندر میں بہترین قسم کی قالین بچھی ہوئی ہے۔ عمارت کے چاروں مینار پر سونا منڈھا ہوا ہے۔ اسی روضہ کے اندر آپ کے صاحبزادے معصوم حضرت علی اصغرؑ شہید کا مزار اور حضرت علی اکبرؓ کے مرقدِ اقدس بھی ہیں۔ روضہ کے قریب ہی گنج شہیداں بھی ہے جس میں 12 شہدائے ہاشمی اور حضرت قاسمؓ صاحبزادے حضرت امام حسنؓ دفن ہیں۔ ہال کے دوسری طرف مقام شہادت ہے۔ روضہ کی تعمیر کا شجرہ بھی نصب ہے جو قمر بنی ہاشم لکھا ہوا ہے۔

کربلا کا محل وقوع اور اس کے نام:

علامہ جزائری مفتی اپنی کتاب ”کربلا و نجف“ میں ہی لکھتے ہیں کربلا سید شبان جنت کی خوابگاہ، باغوں سے گھرا ہوا یہ چھوٹا سا خوبصورت شہر نہر فرات سے تھوڑا ہٹ کر 32 درجہ، 55 دقیقہ طول اور 34 درجہ 40 دقیقہ عرض البلد پر واقع ہے۔ اس سے پیشتر چونکہ دریائے فرات، کربلا سے مل کر بہتا تھا اس لئے اس کا نام طف (کنارہ نہر) پڑا۔ اس نام کے علاوہ کربلا کے اور بھی بہت سے نام ہیں کہ جن کی کثرت اس جگہ کی عظمت واہمیت پر دلالت کرتی ہے۔ کربلا کو طف کے ساتھ حائر، حیر، نینوا، غاضریات، مشہد الحسین، شاطی انصرا، عمورا، ماریہ اور نو اویس بھی کہتے ہیں۔ کربلا کی وجہ تسمیہ: اس نام کی جو وجہ جو اظہر من الشمس ہے وہ تو شاید ہی کوئی اس نام سے دلچسپی رکھنے والا نہ جانتا ہو۔ یہ زمین ہمیشہ سے اپنی کرب وبلا میں شہرہ آفاق رہی ہے۔ اس تو جیہہ کے مقابلہ میں ایک تو جیہ یہ بھی ہے کہ کربلا کرب سے مشتق ہے۔ کرب زمین کے نرم کرنے کو کہتے ہیں۔ کربلا کی زمین چونکہ نرم اور نشیبی واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا نام کربلا پڑا۔ دوسری تو جیہہ یہ ہے کہ کربلا کی اصل کور بابل ہے۔ کور کے معنی طبیعت کے ہیں یعنی بابل کی طبیعت رکھنے والی زمین۔ ان تینوں تو جیہوں میں پہلی ہی تو جیہہ انسب ہے۔ کربلا کے بعد اس زمین کا دوسرا مشہور زبان زد نام ”حائر“ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ اہل تاریخ کا کہنا ہے کہ ”حائر“ چونکہ اسم فاعلی ہے حیر کا اور ”حیر“ خود کربلا کا نام بھی ہے اور حیر لغت میں اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی آ کر جمع ہو جائے اور نکل نہ سکے۔ کربلا ایک نشیبی جگہ ہے، جس کی وجہ سے یہاں پانی جمع رہتا تھا۔ اس لئے اس کا نام حائر پڑا۔

ISSN # : 3080-9746

امتحان خواب اور حقیقت کی کشمکش

حفیظ اللہ خان

گزشتہ سے پیوسط

میں ایک ایسی لڑکی تھی جو کتابوں کو اپنی دنیا سمجھتی تھی۔ کتابیں میرے لیے سکون اور خوابوں کی دنیا کا دروازہ تھا۔ لیکن وقت کی گردش نے میری شخصیت کا وہ حصہ مٹا دیا جو کبھی کتابوں سے جڑا تھا۔ اب میرے لیے کتابوں کی وہ اہمیت ختم ہو چکی تھی جو کبھی زندگی کا محور ہوا کرتی تھی ایک دن میں کمرے میں موبائل سائیلنٹ کرنا بھول گئی تھی جب اس پر کمال کی کال آئی اور گھنٹی بجی تو امی کو شاید شک ہوا تھا اور میرے کمرے آئیں۔ کیا یہ کوئی فون تھا۔

نہیں امی! یہ۔۔۔!! MP3 پر سونگ کی آواز تھی یہ دیکھے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے جلدی سے بتایا۔

☆☆☆☆

رول نمبر سلپ اور ابو کی خوشی:

ابو ہمیشہ میرے لیے کچھ نہ کچھ بہتر سوچتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تعلیم مکمل کروں اور کامیابی کے زینے چڑھوں۔ ایک دن جب وہ دفتر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر ایک خوشی تھی جو وہ چھپا نہیں سکتے تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور ایک کاغذ لہراتے ہوئے بولے:

بیٹا، یہ تمھاری رول نمبر سلپ ہے۔ اگلے ہفتے سے تمھارا انٹرنس یعنی میٹرک امتحان شروع ہو رہا ہے۔

ان کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جل رہے تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ میں ان کی توقعات پر پورا اتروں گی۔ لیکن ان کی خوشی میرے لیے بےمعنی تھی۔ میں نے بس ایک ہلکی سی بناوٹی مسکراہٹ ظاہر کی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ ابو کتنے سادہ ہیں، وہ ایک رول نمبر سلپ پر اتنے خوش ہو رہے ہیں جیسے یہ کوئی کروڑوں کا بنک چیک ہو۔

اگلے ہفتے پیر کے دن میرا پہلا پرچہ تھا۔ جیسے پہلی میں بتا چکی ہوں کہ ہمارے گاؤں سے 17 میل دور ایک گرلز ہائی سکول تھا جہاں امتحاں ہال بھی تھا۔ ابو نے اپنی تمام تر ذمہ داریاں ایک طرف رکھ کر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہر روز صبح مجھے امتحانی مرکز تک لے جاتے، مجھے وہاں چھوڑتے اور ریلوے اسٹیشن چلے جاتے تب شام کو وہ دوبارہ آتے اور مجھے گھر لے آتے۔ لیکن ابو کی یہ قربانی میرے دل کو نہیں چھو رہی تھی۔ میں ایک ایسی کشمکش میں گرفتار تھی جس نے میرے جذبات کو سلب کر رکھا تھا۔ امتحانات کے دن میرے لیے ایک بوجھ بن گئے تھے۔

پہلے دن ابو مجھے امتحانی مرکز چھوڑنے گئے۔ جب میں وہاں پہنچی تو دیگر طالبات کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان میں سے پانچ طلباء تو میرے کلاس فیلو تھیں وہ سب اپنی

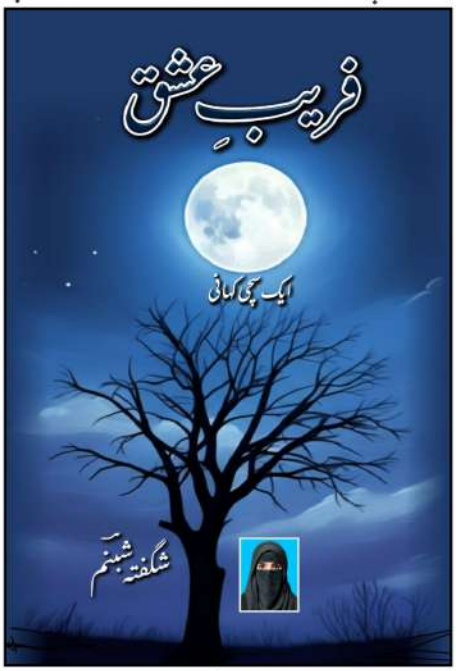

تیاریوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر عزم اور اعتماد واضح تھا۔ لیکن مجھے ایک لمحے کے لیے بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی کہ میں اس طرح کی محنت کیوں نہیں کر سکی۔

پرچہ جب سامنے آیا تو میں کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، سوالات میرے سر سے اوپر گزر رہے تھے،،،،،

،،،،،ویسے دکھاوئے کیلئے میں نے قلم اٹھایا اور بس وقت گزارنے کے لیے کچھ لکھنے لگی۔ میرے پاس نہ کوئی عزم تھا اور نہ کوئی دلچسپی۔ مجھے یہ سب بےمعنی لگ رہا تھا۔ جب پرچے کا وقت ختم ہوتا اور ہم باہر آجاتیں تو سب ایک دوسرے سے پرچے کے بارے میں پوچھتیں فلاں سوال مشکل تھا یہ سوال تو دوسرے باب سیتھا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ مجھے ان باتوں پر ہنسی آتی تھی یہ بے

چاریاں کیا جانتی ہیں؟ کہ زندگی کا اصل مزہ کیسا اور کہاں ہے!! بس میں بھی ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتی کہ پرچہ تو آسان تھا میں نے سارے سوالات حل کیے۔ ان سہلیوں کی محفل میں، میں بوریت محسوس کرتی اور ابو کا انتظار کرتی کہ جلدی اس کتابی باتوں سے نکل جاؤں۔

☆☆☆☆

کمال کی باتیں اور میری گمراہی:

اصل میں رات کے اوقات میرے لیے سب سے اہم ہو چکے تھے لیکن ان کا تعلق میری تعلیم سے نہیں تھا۔ میں کمال کے ساتھ فون پر باتوں میں مشغول رہتی۔ اس کی باتیں میرے لیے دنیا کی سب سے خوبصورت لمحے تھیں۔ وہ مجھے خواب دکھاتا، مستقبل کے سنہرے دنوں کی کہانیاں سناتا۔

"پڑھائی کا کیا فائدہ؟ تمھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کمائی کے لیے میں ہوں۔ تم میری مہارانی بنو گی۔ ہم ایک خوبصورت زندگی گزاریں گے۔"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کمال کہتا۔

کمال کے الفاظ میرے دل کو تسکین دیتے تھے۔ وہ میرے لیے خوابوں کی دنیا کا دروازہ کھول دیتا تھا جس میں سب کچھ خوشیوں سے بھرپور تھا میں نے ابو کی محبت اور محنت کے باوجود میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ مجھے نہ ان کی محنت کی قدر تھی اور نہ اپنی تعلیم کی اہمیت کا احساس تھا۔

ISSN # : 3080-9746

شخصیت پرستی کی غلط روش اور اس کے نتائج

تحریر وتحقیق: محمد فاروق عزمی

پاکستانی معاشرے اور سیاست میں شخصیت پرستی کا رجحان ہمیشہ سے رہا ہے۔ ہم جسے اپنا راہنما یا لیڈر پسند کر لیں پھر اس کے سارے عیب اور ساری خامیاں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

شخصیت پرستی (Hero worship) سے مراد کسی راہنما، عالم، سیاسی شخصیت، کھلاڑی، فلم کے ہیرو یا کسی مشہور ومعروف فرد کو اس قدر اہمیت دینا کہ اس کی باتوں اور اعمال کو تنقید واحتساب سے بالاتر سمجھنا۔ شخصیت پرستی انسان کو حق اور باطل کا فیصلہ شخصیت کی بنیاد پر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر اس شخصیت کی غلطیوں اور بداعمالیوں کو بھی درست سمجھا جانے لگتا ہے۔ شخصیت پرست انسان کی اپنی سوچ، آزادانہ رائے اور تنقیدی فکر ختم ہو جاتی ہے۔ اور اپنی پسندیدہ شخصیت کی غلط اور بری باتیں بھی درست اور اچھی لگنے لگتی ہیں۔ یہی شخصیت پرستی کا نقصان ہے۔ اعتدال اور انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم عظیم شخصیات کا احترام کریں۔ ان کی خوبیوں کو سراہیں لیکن انہیں تنقید اور احتساب سے بالاتر نہ سمجھیں۔ اصل معیار ہمیشہ حق، اصول اور اخلاق ہونے چاہئیں، کردار اور عمل ہونا چاہیے نہ کہ کسی کا خوبصورت، دلکش، ہینڈسم، زیادہ تعلیم یافتہ یا ہیرو ہونا۔ شخصیت پرستی بعض اوقات لوگوں کو کسی بڑے مقصد یا اچھے کام کے لیے متحد کر سکتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر اس کے منفی اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان حق اور باطل کا معیار اصولوں کے بجائے افراد کو بنا لیتا ہے۔ نتیجتاً تنقیدی سوچ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اختلافِ رائے برداشت نہیں کیا جاتا اور شخصیت کی غلطیوں کو بھی درست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ رویہ فکری جمود، تعصب اور معاشرتی تقسیم کا سبب بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستانی معاشرہ بری طرح تقسیم ہو چکا ہے۔ اور اس تقسیم کی ایک اہم وجہ شخصیت پرستی کا وہ رجحان ہے جو گزشتہ کچھ برسوں سے ایک خاص طبقے کے دل ودماغ پر بری طرح حاوی ہے اور انھیں سوچنے سمجھنے اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس طبقے میں ایک بڑی تعداد پاکستان کے نوجوانوں کی ہے۔ جو پاکستان کا مستقبل ہیں۔ لیکن شخصیت پرستی کے "آکٹوپس" (OCTOPUS) نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا لہو چوس چوس کر انہیں اچھے برے کی تمیز سے محروم کر دیا ہے۔ اب نہ تو انھیں وطن عزیز کے مفاد کی پروا ہے اور نہ ہی یہ پاکستان کے کسی ادارے، قانون یا نظام کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے لیے ان کی "من پسند شخصیت" پاکستان کی سلامتی، پاکستان کے قانون اور پاکستان کے اداروں سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ اس منفی سوچ کے اس قدر اسیر ہو چکے ہیں کہ اگر ان کی "محبوب شخصیت" نہ رہے تو خدانخواستہ (خاکم بدہن) پاکستان بھی نہیں رہے گا۔ اس منفی فکر کے حامل افراد دن رات پاکستان اور اس کے اداروں کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہیں، الزام تراشیاں کرتے ہیں اور انتہائی غلیظ گالیاں بکتے ہیں۔ یہ رویہ اور یہ روش انتہائی قابلِ مذمت اور لائقِ گرفت ہے۔ جس قدر بے ہودہ اور ننگی زبان سوشل میڈیا پر پاکستان اور اس کے اداروں خصوصاً ایک اہم دفاعی ادارے کے خلاف استعمال ہوتی ہے یہ بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی محبِ وطن پاکستانی کی زبان سے تو ادا نہیں ہو سکتا۔

یا تو یہ لوگ چند ٹکوں کی خاطر مادرِ وطن سے بے وفائی اور غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں یا یہ پاکستان دشمن قوتوں (بھارت، اسرائیل اور امریکہ) کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک مسلم معاشرے میں اس قدر بے ہودہ اور فحش زبان کا استعمال کم از کم کوئی کلمہ گو تو نہیں کر سکتا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی تلخی، الزام تراشی اور سخت زبان کا آغاز حالیہ دور میں نہیں ہوا۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں بھی سیاسی مخالفین پر سخت تنقید کی جاتی تھی۔ لیکن عمومی طور پر گفتگو میں ایک حد تک شائستگی اور آداب کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ سیاسی ماحول میں نمایاں تلخی 1970 کی دہائی میں بڑھی جب مشرقی پاکستان کے بحران، اقتدار کی کشمکش اور شدید نظریاتی تقسیم نے سیاسی مکالمے کو متاثر کیا۔ بعد ازاں 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں سیاسی جماعتوں کے درمیان محاذ آرائی میں اضافہ ہوا۔ اس دور میں ایک دوسرے پر کرپشن، غداری اور نااہلی کے الزمات عام ہوئے اور سیاسی برداشت کمزور پڑنے لگی۔ لیکن پھر بھی کسی حد تک ایک دوسرے کا ادب واحترام اور چھوٹے بڑے کا لحاظ اور رکھ رکھاؤ تھوڑا ہی سہی باقی تھا۔ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب شدید اختلاف کے باوجود راہنما ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ خود قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے ساتھی جو تحریکِ پاکستان کے اہم کردار تھے۔ شدید اختلاف کے باوجود فریقِ مخالف کا احترام کرتے اور ذاتیات پر حملہ آور نہیں ہوتے تھے۔ سیاسی مکالمے، پارلیمانی روایت اور علمی مباحث کی روایت بھی موجود تھی۔

تاہم "آؤ تو" تضحیک آمیز القابات، سوشل میڈیا مہمات اور کھلے عام گالی گلوچ پر مبنی سیاسی کلچر نے خاص طور پر 2010 کے بعد زیادہ شدت اختیار کر لی۔ تحمل برداشت اور رواداری اس لیے رخصت ہوتے گئے کہ سیاست میں اصولوں اور پالیسیوں کے بجائے شخصیات کو مرکزیت حاصل ہوتی گئی۔ سیاست جب نظریے کے بجائے شخصیت کے

ISSN # : 3080-9746

گرد گھومنے لگے تو اختلاف رائے جلد ہی ذاتی دشمنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ایک پوری نوجوان نسل ہیروازم کا شکار ہو کر شخصیت پرستی کے گھنے جنگل میں گم ہوگئی۔ اس نوجوان نسل نے جس شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو کر، اخلاقی، معاشرتی اور سماجی قدروں کو بری طرح پامال کیا اور جس شخص کو اپنا راہنما، مسیحا اور سب کچھ سمجھ کر اپنا اخلاق، تربیت، مستقبل حتیٰ کہ اپنا دین ایمان تک داؤ پر لگا دیا۔ اس شخص میں حقیقی قیادت کے اوصاف نہ ہونے کے برابر تھے۔ محض شخصیت کے جادو سے یا ہیروازم کے زور پر اس " شخص " نے ناپختہ ذہنوں کو ہپناٹائز کیا، سبز باغ دکھائے، اور جھوٹ کا سہارا لے کر اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

حقیقی قائد وہ ہوتا ہے جو اپنے کردار، دیانت، انصاف پسندی اور خدمتِ خلق کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائے۔ اور انھیں خیر وفلاح کی راہ پر گامزن کرے۔ حقیقی قیادت محض عہدے، اختیار یا شہرت کا نام نہیں بلکہ لوگوں کی راہنمائی، خدمت اور اصلاح کا نام ہے۔ ایک حقیقی لیڈر کو سچا، دیانت دار اور امانت کا پاسبان ہونا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ بلا امتیازِ سیاسی وابستگی عدل وانصاف کرے۔ اس میں خدمت خلق کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو۔ وہ اپنی ذات کے بجائے قوم، عوام اور اپنے ملک کے مفاد کو ترجیح دے۔ وہ جھوٹ سے نفرت کرتا ہو۔ ایک حقیقی راہنما کو بہت احتیاط کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیے۔ اسے نرم خُو، بردبار، خوش اخلاق ہونا چاہیے۔ جو قانون کا احترام کرتا ہو اور مخالفین کے ساتھ بھی "حُسن اخلاق" کا مظاہرہ کرے۔ نہ کہ اوئے توئے اور گالم گلوچ خود بھی کرے؟ اور اپنے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دے۔

شخصیت پرستی کا علاج یا حل حق پرستی، علم، مثبت تنقیدی سوچ، مشاورت اور اصول پسندی میں ہے۔ کسی شخصیت کے بجائے حق، انصاف، قانون اور اخلاقی اصولوں کو معیار بنایا جائے۔ اپنی محبوب شخصیت کے ہر عمل اور رائے کو دلیل اور شواہد کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ شخصیات کے بجائے حق، انصاف، قانون اور اخلاقی اصولوں کو ترجیح دی جائے۔ اداروں، سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں میں فیصلے ایک فرد کے بجائے اجتماعی دانش سے کیے جائیں۔ بزرگوں اور راہنماؤں کے احترام اور عقیدت میں توازن رکھا جائے۔ احترام اپنی جگہ، لیکن کسی انسان کو خطا سے مبرا سمجھنا درست نہیں۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسوہ کو اپنایا جائے۔ کیونکہ اسلام نے شخصیت پرستی کے بجائے حق پرستی کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالتے وقت فرمایا تھا: "اگر میں درست چلوں تو میری مدد کرو اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرو"

اسلام میں گالی گلوچ، بدزبانی اور دوسروں کی توہین کو سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ مسلمان کو نرم خُو مہذب اور پاکیزہ زبان استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ترجمہ: "اور لوگوں سے بھلی بات کیا کرو"" (سورۃ البقرہ آیت 83 پارہ 1)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے۔ ترجمہ: '' اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو " (سورۃ الحجرات، آیت 11 پارہ 26)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، فحش گو اور بدزبان نہیں ہوتا" (جامع ترمذی حدیث نمبر 1977) ایک اور حدیثِ مبارکہ میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں" (صحیح بخاری حدیث نمبر 10، صحیح مسلم حدیث نمبر 40)

قرآن و حدیث مسلمانوں کو شائستہ گفتگو، نرم لہجے، برداشت اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایک سچے مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ اس کی زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اختلاف کے وقت بھی تہذیب اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ آج وطن عزیز کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اختلافِ رائے کے حق کو تسلیم کرنا، سیاسی مخالف کا احترام کرنا ہے۔ اور شخصیت پرستی کے سحر سے نکل کر دلیل، مکالمے اور برداشت کی اس روایت کو زندہ کرنا ہے جو کسی بھی جمہوری معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے۔

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح

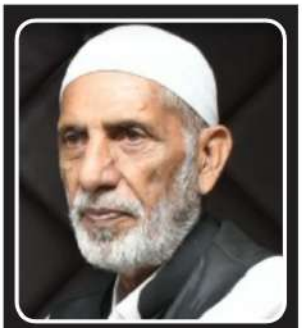

تحریر: حکیم راحت نسیم سوہدروی

پاکستان کی تاریخ میں چند شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے اپنی بصیرت، فراست اور کردار کے ذریعے قوم کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے جگہ بنالی۔ ان ہی عظیم شخصیات میں محترمہ فاطمہ جناح کا نام نمایاں ہے۔ قوم انہیں محبت اور احترام سے "مادرِ ملت" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف تحریکِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی تعمیر واستحکام پاکستان، جمہوریت، قومی یکجہتی اور عوامی حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ ان کی زندگی خدمت، ایثار، دیانت اور عزم و استقلال کی روشن مثال ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح 31 جولائی 1893ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ وہ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی چھوٹی بہن تھیں۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے طب کے شعبے کا انتخاب کیا اور دندان سازی (ڈینٹسٹری) کی تعلیم مکمل کی۔ اس زمانے میں خواتین کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں تھا، لیکن فاطمہ جناح نے اپنے عزم اور محنت سے یہ ثابت کیا کہ خواتین ہر شعبے میں کامیابی حاصل کرسکتی ہیں۔

فاطمہ جناح کی زندگی کا ایک اہم پہلو ان کا اپنے بھائی محمد علی جناح کے ساتھ غیر معمولی تعلق تھا۔ جب جناح صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو فاطمہ جناح نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ نہ صرف ایک بہن بلکہ ایک قابلِ اعتماد مشیر اور رفیقِ کار بھی تھیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہوں نے مسلم خواتین کو منظم کرنے، ان میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور انہیں قومی جدوجہد میں شریک کرنے کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

تحریکِ پاکستان میں فاطمہ جناح کا کردار انتہائی اہم تھا۔ وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتیں، خواتین کے اجتماعات سے خطاب کرتیں اور مسلمانوں کو ایک الگ وطن کے قیام کی ضرورت سے آگاہ کرتیں۔ ان کی تقاریر میں اعتماد، خلوص اور قومی جذبہ نمایاں ہوتا تھا۔ انہوں نے خواتین کو گھر کی چار دیواری سے نکل کر قومی معاملات میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ پاکستان میں خواتین کی بھرپور شرکت ممکن ہوئی۔

1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد ملک کو بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ لاکھوں مہاجرین سرحد پار کرکے پاکستان آئے تھے اور انہیں رہائش، خوراک اور طبی سہولیات کی ضرورت تھی۔ فاطمہ جناح نے اس مشکل وقت میں متاثرین کی خدمت کے لیے دن رات کام کیا۔ انہوں نے مہاجرین کے کیمپوں کا دورہ کیا، ان کے مسائل سنے اور ان کی مدد کے لیے مختلف اقدامات کیے۔ ان کی خدمات نے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے احترام اور محبت پیدا کی۔

فاطمہ جناح خواتین کی تعلیم اور فلاح و بہبود کی زبردست حامی تھیں۔ ان کا یقین تھا کہ کسی بھی قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خواتین کو تعلیم اور مساوی

ISSN # : 3080-9746

مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔ انہوں نے مختلف سماجی اور فلاحی اداروں کی سرپرستی کی اور خواتین کو معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے کی ترغیب دی۔ ان کی سوچ آج بھی پاکستانی خواتین کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کے انتقال کے بعد فاطمہ جناح نے قومی معاملات پر گہری نظر رکھی۔ جب انہیں محسوس ہوا کہ ملک میں جمہوری

اقدار کمزور ہو رہی ہیں تو انہوں نے عوامی آواز بننے کا فیصلہ کیا۔ 1965ء میں انہوں نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور آمریت کے خلاف جمہوری قوتوں کی نمائندگی کی۔ اگرچہ وہ انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکیں، لیکن ان کی جدوجہد نے ملک میں جمہوریت کے فروغ کے لیے ایک نئی امید پیدا کی۔ ان کا یہ اقدام اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے بجائے حق اور انصاف کے لیے آواز بلند کرنے پر یقین رکھتی تھیں۔

فاطمہ جناح کی شخصیت نہایت باوقار، سادہ اور مضبوط تھی۔ وہ سادگی کو پسند کرتی تھیں اور عوام کے مسائل کو اپنی ترجیح سمجھتی تھیں۔ ان کے کردار میں دیانت داری، اخلاص، حب الوطنی اور بے لوث خدمت کے عناصر نمایاں تھے۔ انہوں نے کبھی ذاتی مفادات کو قومی مفاد پر ترجیح نہیں دی۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو قوم کی خدمت اور پاکستان کی ترقی کے لیے وقف تھا۔ ان کی تحریروں اور تقاریر سے بھی ان کی گہری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

انہوں نے ہمیشہ قومی اتحاد، جمہوری روایات اور قانون کی بالادستی پر زور دیا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ پاکستان کی مضبوطی اس کے عوام کے اتحاد اور جمہوری نظام کے استحکام میں پوشیدہ ہے۔ ان کے خیالات آج بھی پاکستان کے سیاسی اور سماجی منظرنامے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ 9 جولائی 1967ء کو فاطمہ جناح اس دنیا سے رخصت ہو گئیں، لیکن ان کی خدمات اور قربانیاں آج بھی زندہ ہیں۔ قوم ان کی جدوجہد کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ان کی وفات سے پاکستان ایک مخلص رہنما، سماجی کارکن اور جمہوریت پسند شخصیت سے محروم ہو گیا، مگر ان کا نام تاریخ کے سنہرے صفحات میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

آج جب ہم مادرِ ملت فاطمہ جناح کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی عظیم خاتون نظر آتی ہیں جس نے ہر مرحلے پر قوم کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ انہوں نے خواتین کو بااختیار بنانے، قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی شخصیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اخلاص، محنت، دیانت داری اور قومی خدمت کے جذبے سے بڑے سے بڑا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مادرِ ملت فاطمہ جناح صرف ایک تاریخی شخصیت نہیں بلکہ ایک نظریہ، ایک حوصلہ اور ایک مثال ہیں۔ ان کی زندگی آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اگر ہم ان کے اصولوں اور افکار کو اپنائیں تو ایک مضبوط، ترقی یافتہ اور خوشحال پاکستان کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ یہی ان کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ہوگا اور یہی ان کی خدمات کا حقیقی اعتراف بھی۔

AL MAALIK ART GROUP
LAHORE - PAKISTAN
+92-311-149-1458
www.almaalikartgroup.com
ADEEL AHMAD KHAN
CEO

BUSINESS CARD | FAVOR BOX | BROCHURS | TISSUE BOX
POSTER | CAPS | CERTIFICATES | BOOKS & COPIES
TEA MUG | STICKERS | ENVELOPES | PEN
WEDDING CARDS | FILE FOLDER | FLYERS | PRICE TAG
GOODIE BAGS | FLEX STANDEE | PVC CARDS | KEY CHAIN

ISSN # : 3080-9746

افواہ سازی

بے نقاب
اورنگ زیب اعوان
laghari768@gmail.com

پاکستان میں کوئی کاروبار چلے یا نہ چلے۔مگر افواہ سازی وہ کاروبار ہے۔ جو ہمیشہ کامیابی سے چلتا ہے۔ہمارے ملک میں ہر روز کوئی نہ کوئی افواہ چھوڑ دی جاتی ہے۔آجکل افواہ ساز افواہ پھیلا رہے ہیں۔ کہ موجودہ حکومت گھر جانے والی ہے۔ مگر وقت بتانے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے۔انہوں نے تو سنسنی پھیلانی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کا مقصد ملک کو کسی نہ کسی صورت کمزور کرنا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کی نظریں وزیراعظم پاکستان میاں شہباز شریف اور فیلڈ مارشل سید حافظ عاصم منیر پر لگی ہوئی ہے۔ کیونکہ ایران اور امریکہ کی جنگ رکوانے میں ان دونوں شخصیات کا کلیدی کردار ہے۔ امریکی صدر ان کی تعریفوں کے قصیدے پڑھتے نہیں تھک رہے۔ ایرانی عوام بھی اپنے ان محسنوں کی تعریف کے پل باندھ رہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں افواہ ساز اپنا کاروبار چمکانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ عوام کو یہ باور کروانے میں مصروف ہیں۔ کہ موجودہ وزیراعظم میاں شہباز شریف کمزور ترین وزیراعظم ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ ان کی جگہ محسن نقوی کو وزیراعظم پاکستان لانے کا ارادہ کر چکی ہے۔ویسے تو ہمارے ملک میں کچھ بھی ممکن ہے۔

مگر موجودہ صورتحال میں ایسا ممکن نظر نہیں آرہا۔ کیونکہ پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر جو پذیرائی مل رہی ہے۔ اس میں وزیراعظم پاکستان میاں شہباز شریف کا کلیدی کردار ہے۔ وہ عالمی سطح پر نہ صرف مرکز نگاہ ہیں۔ پاکستان میں بھی ان کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے۔ انہیں خود کو عوامی وزیراعظم بنانا ہوگا۔ جیسے سابق وزیراعظم وصدر پاکستان مسلم لیگ ن میاں محمد نواز شریف عوام کی دلوں کی دھڑکن ہیں۔ وہ عوامی شکایات کے لیے خود عوام کے فون سنتے تھے۔ اور موقع پر ہی انصاف کرتے تھے۔ وہ عوامی مقامات پر عوام میں گھل مل جاتے تھے۔ بدلہ میں عوام بھی ان سے دلی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ عوامی وزیراعظم کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ پاکستان مسلم لیگ ن کا ہر ورکر میاں محمد نواز شریف کو ووٹ دیتا ہے۔ انہیں باقی کسی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ موجودہ وزیراعظم پاکستان میاں محمد شہباز شریف بلاشبہ ایک بہترین اور اعلی پایہ کے ایڈمنسٹر ثابت ہو رہے ہیں۔ مگر عوامی مقبولیت کا گراف ان کا آج بھی بہت نیچے ہیں۔ لیڈر اس وقت اپنی مقبولیت کھو دیتا ہے۔ جب وہ اپنے اور عوام کے درمیان فاصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ فاصلہ ہی افواہ سازوں کو اپنا مکروہ دھندہ کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ جب عوام اپنے منتخب کردہ وزیراعظم کی پشت پر کھڑی ہوتی ہے۔تو وقت کا فرعون بھی اس کو ہٹاتے ہوئے ایک بار سوچتا ہے۔کہ اس کے نتائج کیا ہوگے۔

کہی ملک میں خانہ جنگی اور افراتفری تو نہیں مچ جائے گی۔مگر غیر مقبول لیڈر شپ کو ختم کرنے میں وہ ایک منٹ لگاتے ہیں۔ پیٹرول کی قیمتوں میں کمی احسن اقدام ہے۔اس میں مزید کمی کر کے عوام کی مشکلات میں کمی کرنی چاہیے۔ خدارا اپنے ان مشیروں سے بھی بچیں۔ جو آپ کو غلط مشورے دیتے ہیں۔ لاک ڈاؤن کس لیے لگایا جارہا ہے۔ کہ پیٹرول کی بچت ہو سکے۔ ان عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے۔ کہ وہ رات کو کبھی باہر نکل کر دیکھے عوام گاڑیوں میں بیٹھ کر لمبی لمبی قطاروں میں لگ کر کھانے پینے کی اشیاء خریدتی ہے۔ اور گھنٹوں سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی ہے۔

کیونکہ بیٹھنے کے لیے آپ نے ہوٹل و ریسٹورنٹ بند کر رکھے ہیں۔ آپ کے اس طرز عمل سے پیٹرول کی بچت ہرگز نہیں ہورہی بلکہ اس کا ضیاع ہورہا ہے۔ ان عقل مند مشیروں سے اپنی جان چھوڑائے۔ اور عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ مرکوز کرے۔ وقت جس رفتار سے گزر رہا ہے۔

آپ کی حکومت کے تین سال کا پتہ ہی نہیں چلا۔ دو سال باقی ماندہ عوام کی حقیقی خدمت میں صرف کر دیں۔ ورنہ آپ کے آمرانہ طرز عمل کی وجہ سے پاکستان مسلم لیگ ن ماضی کا قصہ بن کر رہ جائے گا۔ وزیراعلی پنجاب محترمہ مریم نواز شریف بھی اپنی کینیروں کے چنگل سے باہر نہیں نکل پارہی۔ ارکان صوبائی اسمبلی کی ان تک پہنچ نہیں۔ سب کے سب ذلیل وخوار ہورہے ہیں۔وزیراعلی پنجاب محترمہ مریم نواز شریف محلات کی سیاست کررہی ہیں۔

خوشآمدی انہیں سب اچھا کی داستان سنا دیتے ہیں۔ عوام کے اندر پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب کا انہیں حقیقی علم نہیں۔ ان کے تمام ترقیاتی کام بھی بے سود جارہے ہیں۔ کیونکہ عوام اور ان کے درمیان خلیج بہت زیادہ ہے۔ عوام کے منتخب کردہ نمائندے ان سے نہیں مل پاتے۔ تو بیچاری عوام نے ان تک رسائی کیسے حاصل کرنی ہے۔ قیادت اور عوام کے درمیان دوری، بے یقینی بداعتمادی کی فضا کو جنم دیتی ہے۔ سیاسی قیادت کو عوام سے رابطہ بحال رکھنا چاہیے۔ سیاسی قیادت کی مقبولیت ہی اس کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔

افواہ سازی کرنے والے عناصر نے اپنا کام کرتے رہنا ہے۔حکومت وقت کو ان کو شکست فاش دینے کے لیے بہترین حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ اس کے لیے انہیں شاہی سوچ کو ترک کر کے عوامی سوچ اختیار کرنی ہوگی۔ افواہ سازی ایک ایسا مہلک ہتھیار ہے۔ جو کسی بھی حکومت کے لیے زہر قاتل کا کردار ادا کرتا ہے۔

ISSN # : 3080-9746

علم وآگہی کا کمال یہ ہے کہ آدمی یہ پہچان لے کہ کن باتوں کو اہمیت نہیں دینی

تحریر: خسانہ بحر

کہتے ہیں جہالت اندھیرا ہے اور علم روشنی۔ مگر وقت نے یہ سبق بھی دیا ہے کہ ہر روشنی رہنمائی نہیں کرتی۔ بعض روشنیاں آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں، راستہ نہیں دکھاتیں۔ اسی طرح ہر اطلاع، ہر خبر، ہر رائے اور ہر آواز بھی علم نہیں ہوتی۔ علم تو وہ ہے جو انسان کو چیزوں کی حقیقت سمجھنے کا شعور دے، اور آگہی وہ ہے جو اسے یہ سکھائے کہ زندگی کے ہجوم میں کس صدا پر کان دھرنے ہیں اور کن آوازوں کو ہوا کے سپرد کر دینا ہے۔ ہمارا عہد معلومات کی کثرت کا عہد ہے، مگر حکمت کی قلت کا۔ ہر ہاتھ میں ایک اسکرین ہے اور ہر اسکرین پر ایک دنیا آباد ہے۔ ہر شخص مقرر ہے، ہر شخص تجزیہ نگار ہے، ہر شخص جج ہے۔ فیصلے بھی فوری، سزائیں بھی فوری اور کردار کشی بھی فوری۔ اس شور میں سچ کی آواز اکثر دب جاتی ہے اور سنجیدگی تماشے میں بدل جاتی ہے۔

آج کا انسان علم سے نہیں، معلومات سے بوجھل ہے۔ اسے دنیا بھر کے واقعات یاد ہیں مگر اپنے اندر برپا قیامتوں کا علم نہیں۔ اسے دوسروں کی زندگیوں کی تفصیلات معلوم ہیں مگر اپنے کردار کی خامیوں کا ادراک نہیں۔ وہ ہر خبر پر تبصرہ کرتا ہے مگر اپنے ضمیر کی آواز سننے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں۔ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے غیر ضروری باتوں کو ضروری اور ضروری باتوں کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔

ہم ایک اداکار کے لباس پر گھنٹوں بحث کر سکتے ہیں، مگر ایک استاد کی بے قدری پر خاموش رہتے ہیں۔ ہم کسی کی نجی زندگی کے قصے سینہ بہ سینہ منتقل کرتے ہیں، مگر اپنے اردگرد بڑھتی ہوئی بے حسی پر گفتگو سے گریز کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کے عیب تلاش کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنے کی فرصت نہیں رہی۔

سوشل میڈیا نے اس رویے کو مزید تقویت دی ہے۔ یہاں ہر شخص اپنی پسند کی سچائی تخلیق کر لیتا ہے۔ ایک افواہ چند لمحوں میں خبر بن جاتی ہے اور ایک جھوٹ ہزاروں مرتبہ دہرایا جا کر سچ کا روپ دھار لیتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے تحقیق سے زیادہ ردعمل کو اہمیت دینا سیکھ لیا ہے۔ سوچنے سے پہلے بولنا اور جاننے سے پہلے فیصلہ دینا ہماری عادت بنتی جا رہی ہے۔

دانش مند لوگ ہمیشہ جانتے تھے کہ زندگی کا سکون ہر جنگ جیتنے میں نہیں، بہت سی جنگوں سے بچ نکلنے میں ہے۔ ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ ہر تنقید قابلِ توجہ نہیں ہوتی۔ ہر دروازے پر دستک دینے والا مہمان نہیں ہوتا اور ہر آواز مخاطب نہیں کرتی۔

دریا جب سمندر کی طرف بڑھتا ہے تو راستے میں آنے والے پتھروں سے بحث نہیں کرتا۔ وہ اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ درخت جب پھل دار ہوتا ہے تو اس پر پتھر زیادہ پھینکے جاتے ہیں، مگر وہ جواب میں سایہ اور پھل ہی دیتا ہے۔ فطرت کا یہ فلسفہ شاید انسان کے لیے بھی ہے کہ وہ اپنی توانائی ردعمل میں نہیں، تعمیر میں صرف کرے۔

خاندانوں کے ٹوٹنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے درگزر کا ہنر کھو دیا ہے۔ رشتے محبت سے کم اور برداشت سے زیادہ قائم رہتے ہیں۔ ہر لفظ کا حساب، ہر غلطی کا مقدمہ اور ہر لغزش کی سزا اگر لازم قرار دے دی جائے تو کوئی تعلق زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات خاموشی محبت کی سب سے خوبصورت زبان ہوتی ہے۔

قوموں کی زندگی میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ جو معاشرے معمولی اختلافات میں الجھے رہتے ہیں وہ بڑے خواب نہیں دیکھ سکتے۔ جن قوموں کی توانائی الزام تراشی، نفرت اور تقسیم میں صرف ہو جائے، ان کے حصے میں ترقی نہیں آتی۔ ترقی ہمیشہ ان لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو اپنی توجہ اصل مسائل پر مرکوز رکھتے ہیں اور غیر ضروری تنازعات سے خود کو بچا لیتے ہیں۔

لیکن یہاں ایک باریک فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ نظر انداز کرنا اور بے حس ہو جانا دو مختلف باتیں ہیں۔ ظلم کو نظر انداز کرنا بزدلی ہے، ناانصافی پر خاموش رہنا جرم ہے، اور حق بات نہ کہنا اخلاقی کمزوری۔

دانش مندی یہ نہیں کہ انسان ہر معاملے سے لاتعلق ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ طے کر سکے کہ کہاں بولنا فرض ہے اور کہاں خاموشی وقار۔

زندگی آخر کار ترجیحات کا نام ہے۔ ہم جس چیز کو اہمیت دیتے ہیں، رفتہ رفتہ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی توانائی لوگوں کی رائے، افواہوں، حسد، مقابلے اور بے مقصد بحثوں پر صرف کرتے رہیں گے تو اندر سے کھوکھلے ہوتے جائیں گے۔ لیکن اگر ہم علم، کردار، محبت، خدمت اور خود احتسابی کو اہمیت دیں تو یہی چیزیں ہماری شخصیت کا حصہ بن جائیں گی۔

اس تیز رفتار دنیا میں شاید سب سے بڑی حکمت یہی ہے کہ انسان انتخاب کرنا سیکھ لے۔ ہر بات سننا ضروری نہیں، ہر منظر دیکھنا ضروری نہیں، ہر بحث میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ کچھ باتوں کو نظر انداز کرنا بھی شعور کی علامت ہے۔

کیونکہ عمر مختصر ہے، وقت محدود ہے اور زندگی اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے کہ اسے ہر آواز کے تعاقب میں ضائع کر دیا جائے۔ علم کا کمال بہت کچھ جان لینے میں نہیں، بلکہ یہ جان لینے میں ہے کہ کن باتوں کو اہمیت نہیں دینی۔

نجی تعلیم: مسائل اور حقیقت

قلمِ حق

انجینئر بخت سید یوسفزئی
engr.bakht@gmail.com

پاکستان میں نجی تعلیمی اداروں کی تعداد گزشتہ دو دہائیوں کے دوران غیر معمولی حد تک بڑھ چکی ہے۔ بظاہر یہ ادارے معیاری تعلیم، جدید تدریسی طریقوں، بہتر نظم و ضبط اور سہولیات سے آراستہ ماحول کی فراہمی کے دعوے کرتے ہیں، لیکن زمینی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو تصویر ہر جگہ یکساں نہیں دکھائی دیتی۔ بہت سے نجی اسکول واقعی قابلِ ستائش خدمات انجام دے رہے ہیں، تاہم ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی بھی موجود ہے جہاں تعلیم سے زیادہ مالی مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے اور والدین کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیم کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور قوموں کی ترقی کا سب سے اہم ستون سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرتے ہیں اور اس امید کے ساتھ انہیں نجی اداروں میں داخل کرواتے ہیں کہ انہیں بہتر مواقع اور روشن مستقبل میسر آئے گا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات والدین کو اس اعتماد کے بدلے مایوسی، پریشانی اور انتظامی نااہلی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نجی اسکولوں کے حوالے سے سب سے زیادہ شکایات فیسوں اور اضافی اخراجات کے بارے میں سامنے آتی ہیں۔ ہر سال مختلف ناموں سے فیسوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے جبکہ والدین کو اس اضافے کی واضح وجوہات بھی فراہم نہیں کی جاتیں۔ داخلہ فیس، سالانہ فنڈ، امتحانی فیس، سرگرمیوں کے اخراجات، کتابوں اور یونیفارم کے نام پر والدین پر مسلسل مالی بوجھ ڈالا جاتا ہے، جس سے متوسط طبقے کے لیے بچوں کی تعلیم ایک بڑا چیلنج بن جاتی ہے۔

اگر بعض نجی تعلیمی اداروں کے مالکان اور انتظامیہ کے طرزِ زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعبہ کئی مقامات پر ایک منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مہنگی گاڑیاں، وسیع کاروباری نیٹ ورک، نئی شاخوں کا تیزی سے قیام اور مالی وسعت اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ بعض اداروں میں تعلیمی معیار کے بجائے آمدنی میں اضافے کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔

میرے اپنے خاندان کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ اس مسئلے کی سنگینی کو واضح کرتا ہے۔ گزشتہ سال میرا بھتیجا ایک نجی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا جہاں ایک ناخوشگوار واقعے کے دوران اسے اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ اس کا ہاتھ فریکچر ہو گیا۔ یہ واقعہ نہ صرف ایک بچے کے لیے تکلیف دہ تھا بلکہ پورے خاندان کے لیے شدید ذہنی اذیت اور تشویش کا باعث بھی بنا۔

اس وقت میں پاکستان میں موجود تھا اور ایک ذاتی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر تھا جب میرے بھائی کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں مجھے بتایا کہ اسکول میں میرے بھتیجے کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کے نتیجے میں اسے طبی امداد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ خبر سن کر میں حیران اور غمزدہ رہ گیا کیونکہ کسی بھی والدین یا سرپرست کے لیے ایسی اطلاع انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

میں نے فوری طور پر اسکول انتظامیہ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے پرنسپل کو فون کیا۔ تاہم معلوم ہوا کہ وہ چھٹی پر تھے اور انہیں واقعے کی مکمل تفصیلات کا علم بھی نہیں تھا۔ یہ بات خود اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ بعض اداروں میں ہنگامی صورتحال سے نمٹنے اور ذمہ دارانہ نگرانی کے نظام میں کتنی کمزوریاں موجود ہیں۔

بعد ازاں میری بات اسکول کے ایک ذمہ دار نمائندے سے کروائی گئی۔ میں نے انتہائی سنجیدگی سے صورتحال کے بارے میں سوالات کیے اور جاننا چاہا کہ واقعہ پیش آنے کے فوراً بعد انتظامیہ نے کیا اقدامات کیے تھے۔ میری توقع تھی کہ اسکول کے پاس ہر سوال کا واضح اور تسلی بخش جواب موجود ہوگا، مگر صورتحال اس کے برعکس نکلی۔

میرا سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ جب بچے کو شدید چوٹ لگی تو کیا والدین یا سرپرستوں کو فوری طور پر اطلاع دی گئی؟ کیا اسکول انتظامیہ نے خود بچے کو اسپتال منتقل کیا؟ کیا ابتدائی طبی امداد فراہم کی گئی؟ بدقسمتی سے ان سوالات کے جوابات غیر واضح اور غیر تسلی بخش تھے، جس سے انتظامی غفلت کا تاثر مزید مضبوط ہوا۔

کسی بھی تعلیمی ادارے کی بنیادی ذمہ داری صرف تعلیم فراہم کرنا نہیں بلکہ طلبہ کی جان، صحت اور حفاظت کو یقینی بنانا بھی ہے۔ اگر کسی بچے کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو فوری ردِعمل، والدین سے رابطہ اور طبی امداد کا انتظام انتظامیہ کی اولین ذمہ داری ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے کسی قسم کی کوتاہی ناقابلِ قبول ہے۔

میں نے واقعے میں ملوث استاد کا نام، اس کے کردار اور پورے واقعے کی تفصیلات طلب کیں تاکہ حقیقت سامنے آ سکے۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی واضح کیا کہ اگر معاملے کو سنجیدگی سے نہ لیا گیا تو میں اسے عوامی سطح پر اٹھانے اور سوشل میڈیا کے ذریعے اجاگر کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب معاملے کو عوامی سطح پر لانے کا ذکر کیا گیا تو صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی۔ مختلف افراد کی جانب

ISSN # : 3080-9746

سے رابطے شروع ہوگئے اور معاملے کو خاموشی سے حل کرنے کی کوششیں تیز ہوگئیں۔اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ بعض ادارے مسائل کے بنیادی حل کے بجائے ان کی تشہیر روکنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

اس واقعے کے بعد متعلقہ استاد کے رشتہ داروں اور جاننے والوں کی طرف سے ملاقاتوں اور رابطوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔اگرچہ تنازعات کا حل بات چیت کے ذریعے نکالنا ایک مثبت عمل ہے،لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ایسے واقعات کو ابتدا ہی میں روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کیوں نہیں کیے جاتے۔

اساتذہ معاشرے کے معمار کہلاتے ہیں اور ان کا کردار صرف کتابی علم منتقل کرنے تک محدود نہیں ہوتا۔وہ بچوں کی شخصیت سازی، اخلاقی تربیت اور اعتماد کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک استاد سے صبر، برداشت،حکمت اور ذمہ داری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔

بدقسمتی سے بعض نجی اسکولوں میں اساتذہ کی بھرتی کے دوران پیشہ ورانہ مہارت اور نفسیاتی تربیت کے بجائے کم تنخواہوں اور فوری دستیابی کو ترجیح دی جاتی ہے۔اس کے نتیجے میں بعض ایسے افراد بھی تدریسی شعبے میں آ جاتے ہیں جو بچوں کی نفسیات اور جدید تدریسی اصولوں سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہوتے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متعدد نجی اسکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ مستقل کیریئر کے بجائے عارضی بنیادوں پر ملازمت کر رہے ہوتے ہیں۔ان کی اکثریت کی خواہش کسی سرکاری ملازمت یا بہتر روزگار کے مواقع حاصل کرنا ہوتی ہے،جس کے باعث بعض اوقات ادارے کے ساتھ طویل المدتی وابستگی اور تعلیمی بہتری کے جذبے میں کمی محسوس کی جاتی ہے۔

تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے جہاں صرف ڈگریاں اور اسناد کافی نہیں ہوتیں۔ایک کامیاب استاد کے لیے بچوں کی نفسیات کو سمجھنا،مختلف ذہنی صلاحیتوں کے حامل طلبہ کے ساتھ مؤثر انداز میں کام کرنا اور مثبت ماحول پیدا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مضمون کا علم ہونا۔

نجی تعلیمی اداروں میں احتساب کے مؤثر نظام کا فقدان بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔بہت سے والدین شکایات کے باوجود یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی آواز کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا یا ان کے تحفظات کو مناسب توجہ نہیں دی جاتی۔

والدین اکثر اس خوف کا شکار رہتے ہیں کہ اگر وہ انتظامیہ کے خلاف آواز بلند کریں گے تو اس کا اثر ان کے بچوں پر پڑ سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے معاملات منظرِ عام پر آنے کے بجائے خاموشی سے دب جاتے ہیں اور مسائل جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر نجی اسکول میں ایک شفاف،غیر جانبدار اور مؤثر شکایتی نظام قائم کیا جائے جہاں والدین اعتماد کے ساتھ اپنے تحفظات پیش کر سکیں اور انہیں بروقت انصاف فراہم کیا جا سکے۔

حکومتی اداروں کو بھی نجی تعلیمی شعبے کی نگرانی کو مزید مؤثر بنانا ہوگا۔صرف فیسوں کے معاملات ہی نہیں بلکہ تدریسی معیار، حفاظتی اقدامات، اساتذہ کی تربیت، طلبہ کے حقوق اور انتظامی شفافیت کا بھی باقاعدہ جائزہ لیا جانا چاہیے۔

یہ حقیقت تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ تمام نجی اسکول ایک جیسے نہیں ہیں۔ملک میں بہت سے ایسے ادارے موجود ہیں جو واقعی معیاری تعلیم، تربیت اور بہترین انتظامی نظام کی مثال بن چکے ہیں اور والدین کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ان کامیاب اداروں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ طلبہ کی تعداد بڑھانے کے بجائے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر توجہ دیتے ہیں۔وہ اساتذہ کی تربیت، والدین کے ساتھ رابطے اور طلبہ کی فلاح و بہبود کو اپنی ترجیحات میں شامل رکھتے ہیں۔

میری رائے میں اگر نجی تعلیمی ادارے صرف تعداد بڑھانے کے بجائے معیار کو اپنی اولین ترجیح بنائیں، والدین کے اعتماد کا احترام کریں،طلبہ کی حفاظت کو یقینی بنائیں اور پیشہ ورانہ تربیت یافتہ اساتذہ کی خدمات حاصل کریں تو نہ صرف ان کی ساکھ بہتر ہوگی بلکہ معاشرے میں ان کا مقام اور عزت بھی مزید بلند ہوگی۔

تعلیم ایک مقدس امانت اور قومی ذمہ داری ہے،اسے محض کاروباری سرگرمی میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔کیونکہ آج کے یہی بچے کل کے ڈاکٹر، انجینئر، استاد، افسر اور قومی رہنما بنیں گے،اور ان کی تعلیم و تربیت میں ہونے والی ہر کوتاہی دراصل پورے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو متاثر کرتی ہے۔

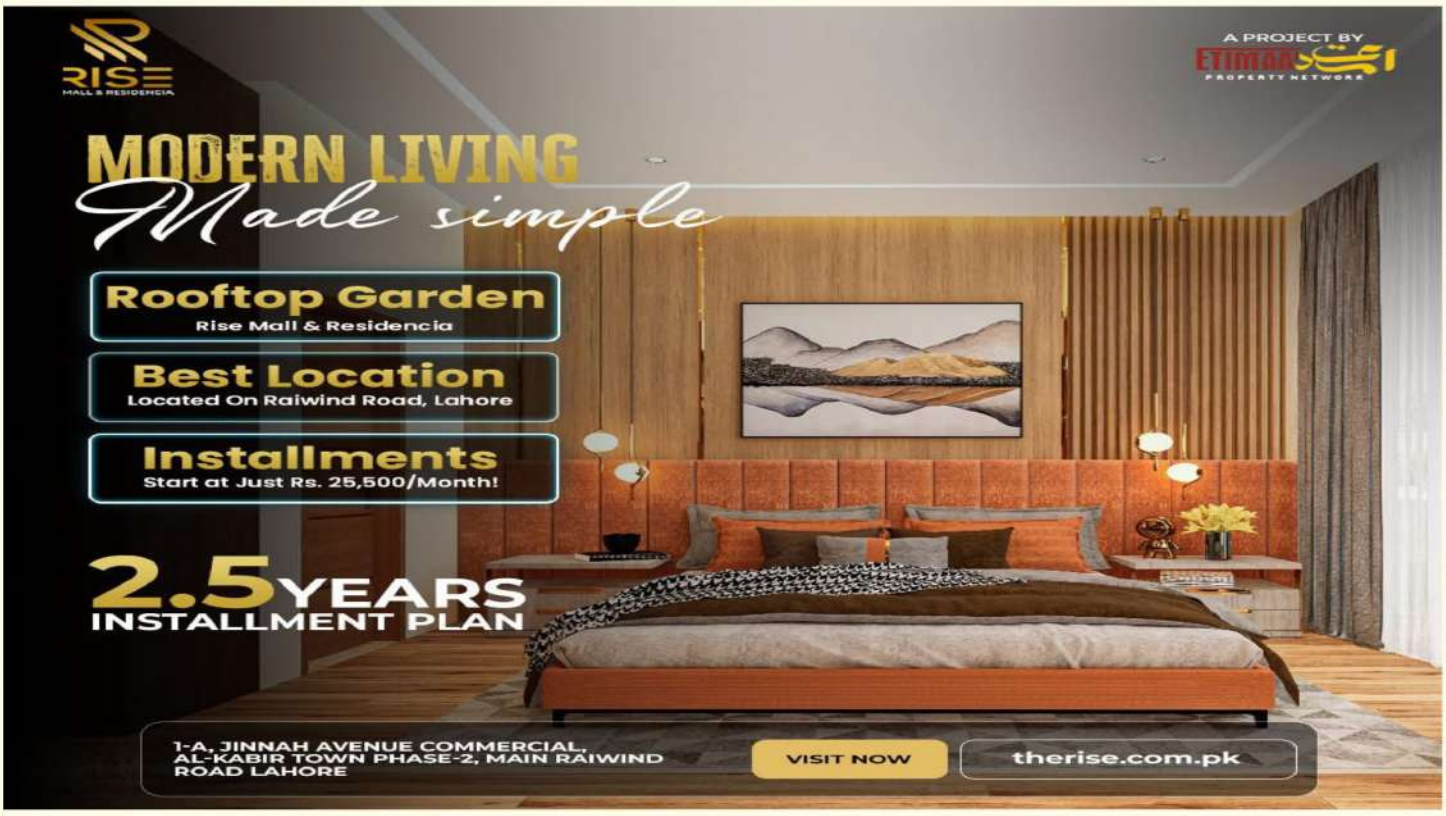

ISSN # : 3080-9746

روایتِ حیا، ارمغانِ سخا: سیرتِ عثمان ذوالنورین کے درخشاں زاویے

18 ذی الحج کو آپکا یوم شہادت عقیدت واحترام سے منایا گیا

تحریر: صاحبزادہ ذیشان کلیم معصومی

18 ذی الحج بروز جمعرات کو آپکا یوم شہادت عقیدت و احترام سے منایا گیا۔

تاریخِ عالم کے افق پر کچھ نام ایقانی تلاطم اور فکر ونظر کی رعنائیوں کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہوتے ہیں کہ ان کی روشنی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ابدیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ وادیِ بطحا کے اس پاکیزہ گلستانِ نبوت میں، جہاں ہر پھول کی اپنی خوشبو اور ہر ستارے کی اپنی چمک تھی، خلیفہ ؟ ثالث امیر المؤمنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا وجودِ مسعود حیا، سخاوت اور فداکاری کا ایک ایسا بحرِ بے کنار ہے جس کی لہروں میں تقویٰ کی چاندنی اور خدمتِ خلق کا نور موجزن ہے۔ قدرت نے آپ کے خمیر میں بچپن ہی سے وہ پاکیزگی اور طہارت ودیعت کر دی تھی کہ دورِ جاہلیت کی تاریک ترین فضا، بدترین اخلاقی برائیاں اور شراب نوشی بھی آپ کے دامنِ عفت پر کسی عیب کا سایہ نہ ڈال سکیں۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی آپ اپنی دیانت، غیر معمولی ذہانت اور خوش اخلاقی کی بدولت مکہ کے کامیاب ترین تاجر کے طور پر ابھرے اور معاشرے نے آپ کی بے لوث سخاوت کی وجہ سے آپ کو "غنی" کے معزز لقب سے نوازا۔

جب جزیرۃ العرب میں اسلام کی پہلی شمع روشن ہوئی تو آپ کے حق پرست دل نے اپنے دیرینہ اور مخلص دوست سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر لبیک کہنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی۔ یوں آپ "سابقون الاولون" کی اس قدسی صفات جماعت میں شامل ہو گئے جنہوں نے توحید کی خاطر اپنے آرام اور کاشانوں کی پروا نہ کرتیں ہوئے ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ کی صَعوبتوں کو گلے سے لگایا۔

خلفائے راشدین میں سے یہ منفرد شرف صرف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے کہ انہوں نے دونوں ہجرتیں کیں اور بلا شبہ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اپنی اہلیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہجرت کی۔

سیدنا عثمان غنی کی شخصیت کا سب سے دلنشین، اعجاز نما اور نمایاں وصف ان کی وہ غیر معمولی "حیا" تھی جس کی گواہی خود مخبرِ صادق، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح مسلم کی روایت کے مطابق یہ فرما کر دی کہ " کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے آسمان کے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں"۔ اسی پاکیزہ کردار کی رفعتوں کے سبب حضور سرورِ کائنات نے اپنی دو صاحبزادیاں، سیدہ رقیہ اور ان کی وفات کے بعد سیدہ ام کلثوم، یکے بعد دیگرے آپ کے عقدِ نکاح میں دیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضورِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک، سوائے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے، کسی شخص کے نکاح میں کسی نبی کی دو بیٹیاں نہیں رہیں اور اسی مایہ ناز خصوصیت کی بنا پر کائناتِ انسانی میں آپ اکیلی وہ شخصیت کہلائے جنہیں "ذوالنورین" یعنی دو نوروں والا ہونے کا ابدی اعزاز حاصل ہوا۔ تاریخ الخلفاء میں علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں ایک کے فوت ہو جانے کے بعد دوسری کی شادی عثمان سے کر دیتا

ISSN # : 3080-9746

اور یہ سب شادیاں حکمِ الٰہی اور وحیِ ربانی کی تعمیل میں ہوئی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ سیدنا رسولِ انام صلی اللہ علیہ وسلم کے سگی پھوپھی کے نواسے بھی تھے اور محبت و اخلاص کا یہ عالم تھا کہ جس ہاتھ سے حضور کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی، زندگی بھر اس کو نجاست سے مس نہیں ہونے دیا۔ قبیلہ ? عشاقِ رسول کے اس سرخیل کا عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت پوری آب وتاب سے چمکا جب صلحِ حدیبیہ کے موقع پر آپ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا تھا کہ عثمان میرے بغیر طوافِ کعبہ نہیں کریں گے، اور یہی ہوا کہ جب سردارانِ قریش نے انہیں طواف کی پیشکش کی تو آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر میں طواف کرلوں، یہ کیسے ممکن ہے؟ اسی والہانہ فدائیت کے پیشِ نظر بیعتِ رضوان کے موقع پر محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک دستِ مبارک کو عثمان کا ہاتھ قرار دے کر خود ان کی طرف سے بیعت فرمائی۔

اسلام کی مالی وجانی خدمت کی بات ہو تو تاریخِ سیرت کے اوراق آپ کے ایثار سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ جب مدینہ کے مسلمان پینے کے پانی کی بوند بوند کو ترس رہے تھے تو آپ نے بیس ہزار درہم کی بھاری رقم صرف کر کے "بئرِ رومہ" نامی کنواں ایک یہودی سے خریدا اور مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ جب غزوۂ تبوک (جیشِ عسرت) کے موقع پر لشکرِ اسلام تنگی کا شکار تھا تو آپ نے پورے لشکر کے ایک تہائی اخراجات کی ذمہ داری تنِ تنہا اپنے کاندھوں پر لے کر نو سو پچاس اونٹ، پچاس گھوڑے اور ایک ہزار دینار بارگاہِ نبوت میں پیش کر دیے، جس پر لسانِ نبوت سے یہ مژدۂ جاں فزا جاری ہوا کہ "آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔ آپ اگرچہ سیدہ رقیہ کی شدید علالت اور تیمارداری کی وجہ سے معرکہ بدر میں بظاہر شریک نہ ہو سکے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے آپ کا تیر چلا کر آپ کو مالِ غنیت اور مجاہدین کے اجرِ عظیم میں برابر کا شریک ٹھہرایا۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ہر نبی کا ایک رفیق ہوتا ہے اور جنت میں میرا رفیق عثمان ہے"۔ ایک مرتبہ جب جبلِ اُحد پر زلزلہ آیا تھا اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کو ٹھوکر مار کر فرمایا تھا کہ "تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں" تو اس وقت اس اشارے سے مراد سیدنا عمر اور سیدنا عثمان ہی تھے۔ جہاں آپ کی سخاوت کے چرچے زبان زدِ عام تھے، وہیں آپ کی ذاتی زندگی زہد، قناعت اور فقرِ اختیاری کا شاہکار تھی۔ آپ لوگوں کو تو لذیذ شاہی کھانے کھلاتے، لیکن خود سرکے اور زیتون کے ساتھ سادہ روٹی تناول فرماتے۔ سلطنت کا اتنا بڑا خلیفہ ہونے کے باوجود دوپہر کے وقت مسجدِ نبوی کے صحن میں چٹائی یا ریت پر سر کے نیچے بازو کا تکیہ بنا کر آرام فرمالیتا۔ راتوں کو اٹھ کر قیام کے دوران ایک ہی رکعت میں پورا قرآن مجید ختم کر لینا آپ کا معمول تھا اور کثرتِ تلاوت کی وجہ سے دل کا کلامِ الٰہی سے رشتہ اس قدر گہرا تھا کہ آپ کا فرمانِ عالی شان ہے: "اگر تمہارے دل گناہوں سے پاک ہو جائیں، تو وہ کبھی اللہ کے کلام کی تلاوت سے سیر نہیں ہو سکتے"۔

امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق کی شہادت کے بعد جب زمامِ خلافت آپ کے دستِ مبارک میں آئی تو آپ نے بارہ سالہ دورِ حکومت میں اسلامی سلطنت کی حدود کو تین براعظموں کے وسیع عریض افق تک پھیلا دیا۔ آپ کے دور میں ایران، افغانستان، آذربائیجان، آرمینیا، جرجان، خراسان، طبرستان، امیران، ماوراء النہر، ایشیائے کوچک اور افریقہ میں مراکش، الجزائر اور طرابلس کے علاوہ یورپ میں اٹلی کیہ، طرطوس اور اندلس کے وسیع علاقے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ آپ ہی کی انتظامی بصیرت کے نتیجے میں تاریخِ اسلام کا پہلا بحری بیڑا تیار ہوا، جس نے بحرِ روم کی موجوں کو چیرتے ہوئے قبرص پر اسلام کا پرچم لہرایا اور جب قیصرِ روم نے چھ سو جہازوں سے شام پر حملہ کیا تو اسے شکستِ فاش دی۔

ایک مدبر حکمران کی حیثیت سے آپ نے بے شمار عسکری اور ریاستی اصلاحات کیں۔ بعض صوبوں میں فوجی اور انتظامی شعبے الگ نہیں تھے، یہ کام سب سے پہلے آپ نے کیا۔ آپ نے فوجیوں کی تنخواہوں اور وظائف میں خاطر خواہ اضافہ کیا، نئے مفتوحہ علاقوں میں مستقل فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور ساحلی علاقوں پر قلعے تعمیر کروائے۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد کر کے مدینہ منورہ میں باقاعدہ ایک "دار القضاء" (عدالت کی عمارت) قائم کی۔ مسافروں اور وفود کے لیے سرکاری مہمان خانے بنوائے اور مدینہ کے اردگرد سیلابی ریلوں سے بچاؤ کے لیے "بندِ مہروز" نامی حفاظتی بند تعمیر کروایا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے جمعہ میں پہلی اذان کا حکم دیا، مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر فرمائیں اور لوگوں کو خود زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا۔ نظامِ حکومت چلانے کے لیے آپ نے ہمیشہ تعلیماتِ نبوی اور سیرتِ شیخین کو پیشِ نظر رکھا اور اپنے تاریخی خطبے میں اعلان فرمایا کہ "میں قرآن وسنت کی پیروی کروں گا اور خلفائے سابقین کے قائم کردہ ان اصولوں پر کاربند رہوں گا جن پر قوم متفق ہوگی"۔

علم ودین کے باب میں آپ کا سب سے بڑا احسان امت پر یہ ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی کے بقول آپ نے قرائت کے تمام اختلافات کو ختم کر کے پوری امت کو ایک مستند حجازی لہجے پر جمع کر دیا اور اسی معرکہ آرا کارنامے کی وجہ سے آپ کو "جامع القرآن" کا ابدی لقب ملا۔

? حیاتِ عثمان کا آخری باب جتنا رقت آمیز ہے، اتنا ہی صبر، استقلال اور رضا کی تاریخ کا تابناک ترین ورق بھی ہے جو میدانِ کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی استقامت کی طرح اسلام کا ایک مایہ ناز اثاثہ ہے۔ خلافت کے آغاز اور انجام میں حضرت عثمان اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما کی شخصیتیں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے امتِ مسلمہ میں انارکی اور خونریزی کو ختم کرنے کی خاطر اپنے اقتدار کی قربانی دے دی مگر مسلمانوں کا خون نہ بہنے دیا۔

خلافت کے آخری ایام میں جب فتنہ پرور عناصر نے مدینہ منورہ میں آپ کے کاشانے کا محاصرہ کر کے آپ کو اس کنوئیں (بئرِ رومہ) کے پانی سے محروم کر دیا جو آپ نے خود خرید کر امت کے لیے وقف کیا تھا، اور اس مسجد (مسجدِ نبوی) میں داخلے سے روک دیا جس کی توسیع آپ نے اپنے مال سے کی تھی، تو اس وقت بھی مصلحتِ امت کے پیشِ نظر آپ کا حلم عروج پر تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب تحفظ کے لیے عسکری نظام چلانے کی پیشکش کی تو عشقِ مصطفیٰ کے اس پیکر نے فرمایا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کو کسی بھی صورت چھوڑ نہیں سکتا، چاہے میری رگِ گردن کاٹ دی جائے"۔ آپ نے جلیل القدر صحابہ کے فرزندوں اور مدینہ کے جوانوں کو تلوار اٹھانے اور مسلمانوں کا خون بہانے سے سختی سے منع فرمادیا کہ "میں شہرِ رسول میں مسلمانوں کا خون بہانے کا سبب نہیں بننا چاہتا"۔ بالآخر چالیس دن کے طویل، پیاسے اور صبر آزما محاصرے کے بعد، اٹھارہ ذوالحجہ پینتیس ہجری (AH35) کو جب یہ ظالم دیواریں پھاند کر آپ کے حجرے میں داخل ہوئے تو سلطنتِ اسلامیہ کا وہ مظلوم شہنشاہ رب کے حضور زانوئے تلمذ طے کیے قرآن پاک کی تلاوت میں محو تھا۔ ان کی بے رحم تلواروں کے وار سے جب آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا کی انگلیاں کٹ گئیں اور آپ کا خونِ پاک کائنات کی سب سے سچی کتاب کے اس صفحے پر گرا جہاں لکھا تھا: "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" (پس ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری کفایت کرے گا، اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے)، تو تاریخِ حیا کی وہ شمع بظاہر گل ہو گئی مگر ان کی سیرتِ طیبہ کا نور، عفو ودرگزر کا حلم اور شہادت کی وہ لازوال داستان ابدیت کے افق پر ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی جس کی خوشبو رہتی دنیا تک دلوں کو ایمان، ایثار اور پاکیزگی کی راہ دکھاتی رہے گی۔

ISSN # : 3080-9746

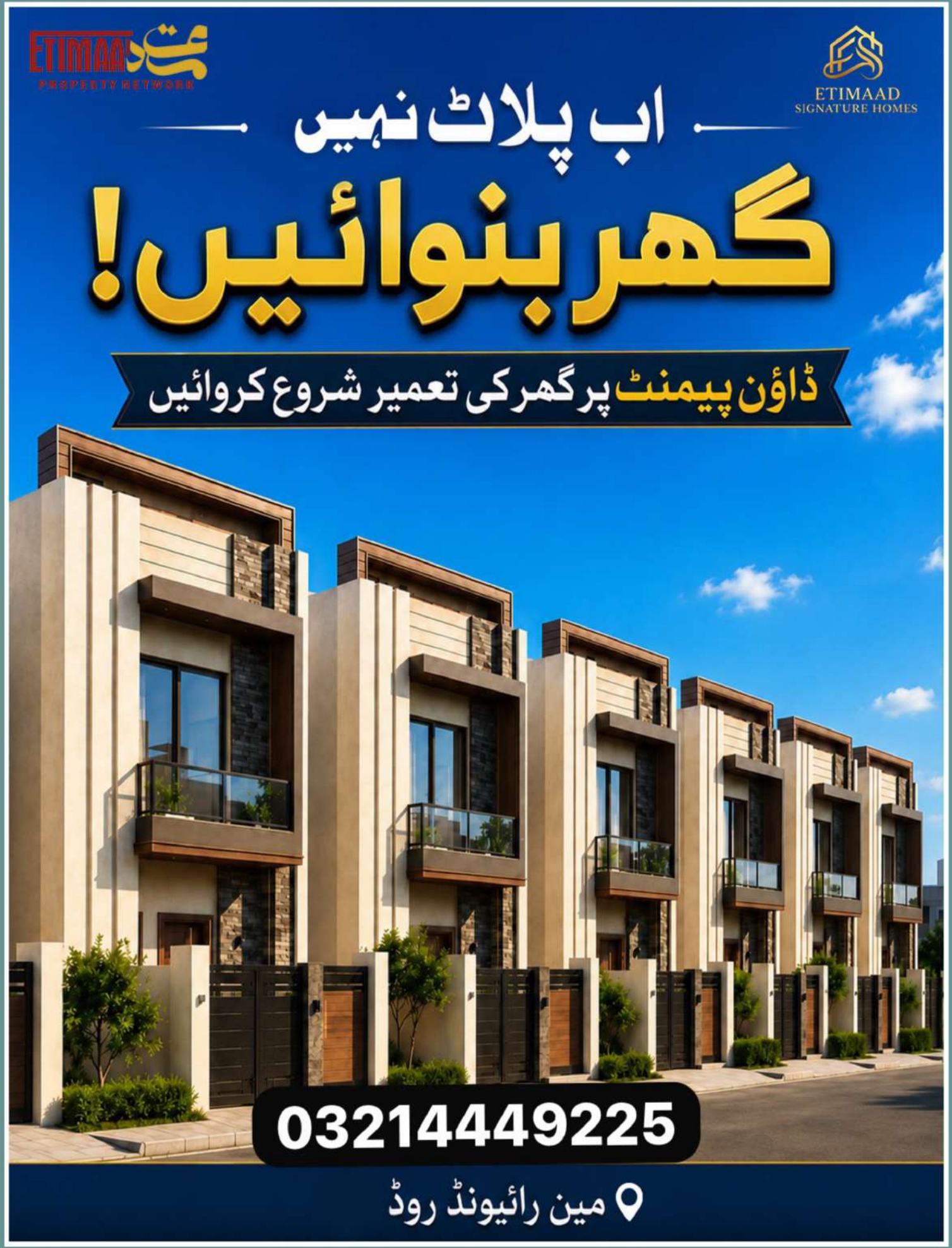

ISSN # : 3080-9746

تحریر: شبانہ ایاز

ترکیہ میں اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش پھر شدت اختیار کر گئی

ترکیہ کا نیا ڈرامہ زیر بحث

ترکیہ میں اس وقت ایک ٹی وی ڈرامہ صرف ایک اسکرین پروڈکشن نہیں رہا۔ یہ ایک سیاسی وتہذیبی بحث بن چکا ہے، ایک نظریاتی ریفرنس پوائنٹ اور ایک ایسا آئینہ جس میں پورا معاشرہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھ بھی رہا ہے اور اس سے نظریں بھی چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

TRT پر نشر ہونے والا ڈرامہ ''Senin :Sule Hikâyen'' بظاہر ایک باحجاب خاتون، شعلہ یوکسل شینلر، کی زندگی پر مبنی ہے۔ مگر ترکیہ میں اس کی اصل بحث یہ نہیں کہ اس میں کیا دکھایا گیا ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ کیوں دکھایا گیا ہے، کس زاویے سے دکھایا گیا ہے، اور کس سیاسی وسماجی لمحے میں دکھایا گیا ہے۔

یہ وہی پرانا سوال ہے جو ترکیہ کی سیاست میں بار بار پلٹ کر آتا ہے کہ کیا ترکیہ ایک مکمل سیکولر ریاست ہے جو مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ رکھتی ہے؟؟؟

یا ایک ایسی قوم ہے جو اپنی اسلامی اور عثمانی تہذیبی جڑوں کو دوبارہ دریافت کر رہی ہے؟؟؟

یہ سوال نیا نہیں۔ لیکن ہر دور میں یہ کسی نئے چہرے، نئے واقعے یا نئے ڈرامے کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

اور اس بار یہ چہرہ ایک باحجاب خاتون کا ہے۔

ترکیہ ایک ملک، دو بیانیے

ترکیہ کو سمجھنے کے لیے اس کی سیاست سے زیادہ اس کے بیانیوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک بیانیہ وہ ہے جو مصطفیٰ کمال اتاترک کے نظریۂ لائیکیت کو ریاست کی بنیاد سمجھتا ہے۔ اس کے مطابق مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے، ریاست کا نہیں۔ جدیدیت، مغربیت اور ادارہ جاتی سیکولرزم ہی ریاست کی بقا کی ضمانت ہیں۔

دوسرا بیانیہ یہ کہتا ہے کہ ترکیہ کی جڑیں صرف اتاترک کے بعد کی تاریخ نہیں بلکہ اس سے پہلے کی عثمانی اور اسلامی تہذیب میں ہیں۔ اس کے مطابق مذہب کو ریاست سے مکمل طور پر الگ کرنا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ سماجی حقیقت سے بھی متصادم ہے۔

یہ دونوں بیانیے صرف نظریاتی نہیں رہے، بلکہ اداروں، عدلیہ، فوج، تعلیم، میڈیا اور ثقافت میں بھی سرایت کر چکے ہیں۔

اسی لیے ترکیہ میں ایک ڈرامہ بھی محض ڈرامہ نہیں رہتا۔

شعلہ یوکسل شینلر، ایک باحجاب خاتون سے علامت تک

شعلہ یوکسل شینلر کی زندگی محض ایک سوانح نہیں بلکہ ایک سماجی وسیاسی سفر ہے۔

وہ ایک باحجاب خاتون تھیں جنہوں نے ایک ایسے دور میں اپنی

شناخت بنائی جب ترکیہ میں مذہبی اظہار، خاص طور پر خواتین کے لیے حجاب، ایک متنازع اور حساس مسئلہ تھا۔

ان کی ابتدائی زندگی تعلیم، ادب اور صحافت سے جڑی ہوئی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ان کا لکھا ہوا لفظ صرف ادب نہیں رہا بلکہ ایک موقف بن گیا۔

وہ ایک ایسے معاشرے میں سامنے آئیں جہاں جدیدیت کا مطلب اکثر مذہب سے فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس ماحول میں ایک باحجاب خاتون کا کھل کر سامنے آنا خود ایک غیر معمولی سماجی واقعہ تھا۔

اِن کی تحریریں صرف ذاتی خیالات نہیں تھیں بلکہ ایک وسیع تر سماجی اضطراب کی نمائندگی کرتی تھیں۔

حجاب، شناخت اور ریاستی دباؤ

1960 اور 70 کی دہائی کا ترکیہ سیاسی طور پر غیر معمولی حساس دور تھا۔ فوجی اثر ورسوخ، ریاستی بیوروکریسی اور سیکولر ادارہ جاتی ڈھانچہ مضبوط تھا۔

اسی دور میں مذہبی شناخت، خاص طور پر حجاب، کو اکثر ریاستی جدیدیت کے منصوبے سے متصادم سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب یونیورسٹیوں، سرکاری اداروں اور سماجی سطح پر مذہبی اظہار پر غیر رسمی مگر مؤثر پابندیاں موجود تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب شعلہ یوکسل شینلر اسی ماحول میں ایک آواز بن کر اُبھریں۔

اِن کی تحریریں، تقاریر اور سرگرمیاں ایک بڑے سماجی طبقے کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگیں اور

یہ صرف ایک فرد کا معاملہ نہیں رہا بلکہ ایک تحریک بن گئی۔

تصادم کا آغاز، جب لفظ جرم بن گیا

یہ وہ لمحہ تھا جب شعلہ یوکسل شینلر اور ریاست کے درمیان ٹکراؤ کھل کر سامنے آیا۔ اس وقت کے صدر جودت سُنائے کے ایک بیان میں حجاب اور مذہبی اظہار کے حوالے سے سخت ریمارکس سامنے آئے جنہیں ریاستی پالیسی کی سمت سمجھا گیا۔

شعلہ یوکسل شینلر نے اس بیان کو نہ صرف تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ اس کے جواب میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں انہوں نے صدر کے مؤقف کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور سماجی آزادیوں کے خلاف قرار دیا اور ریاست کو شہریوں کے مذہبی انتخاب میں مداخلت سے باز رہنے کا مطالبہ کیا۔ اس خط کے بعد ردعمل فوری اور سخت آیا، اسے ریاستی اتھارٹی اور صدر کے وقار پر حملہ سمجھا گیا، جس کے نتیجے میں ان کے خلاف ''صدرِ جمہوریہ کی توہین'' کا مقدمہ قائم ہوا، وہ گرفتار ہوئیں اور انہیں

ISSN # : 3080-9746

سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ واقعہ محض ایک قانونی کارروائی نہیں تھی بلکہ اس نے شعلہ یوکسل شینلر کو ایک فرد سے نکال کر ایک ایسی علامت میں بدل دیا جو ریاستی لائیکیت اور مذہبی شناخت کے درمیان جاری کشمکش کی نمائندگی کرنے لگی۔

وقت کے ساتھ شعلہ یوکسل شینلر ایک فرد سے زیادہ ایک علامت بن گئیں۔

وہ ان خواتین کی نمائندہ بن گئیں جو تعلیم یافتہ بھی تھیں، باوقار بھی تھیں، اور مذہبی شناخت کو بھی اپنی زندگی کا حصہ رکھنا چاہتی تھیں۔

اِن کا نام ایک مخصوص حجاب اسٹائل کے ساتھ بھی جڑ گیا، جو بعد میں ایک سماجی شناخت بن گیا۔

یہاں سے بحث فرد سے نکل کر ثقافت تک پہنچ گئی۔

اور جب کوئی مسئلہ ثقافت بن جائے تو وہ صرف قانون یا سیاست سے حل نہیں ہوتا۔

ڈرامہ۔ ماضی کی واپسی یا موجودہ سیاست کا عکس؟

''Senin Hikâyen:Sule'' صرف ایک تاریخی ڈرامہ نہیں بلکہ ایک موجودہ سیاسی لمحے کی پیداوار ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے جہاں ترکیہ ایک طرف عالمی سطح پر اپنی ثقافتی صنعت کو فروغ دے رہا ہے، اور دوسری طرف اندرونی سطح پر شناختی سیاست ایک بار پھر شدت اختیار کر رہی ہے۔

ڈرامے میں ایک باحجاب خاتون کی کہانی کو مرکز بنا کر دراصل ایک وسیع تر بحث کو دوبارہ کھولا گیا ہے۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ ایک مخصوص نظریاتی بیانیے کو مضبوط کرتا ہے۔

حامیوں کے مطابق یہ وہ تاریخ ہے جسے طویل عرصے تک نظر انداز کیا گیا۔

برہان الدین دوران کا مؤقف اور ریاستی زاویہ

ترکیہ کے ڈائریکٹر جنرل ابلاغیات برہان الدین دوران نے اس ڈرامے کو ترکیہ کی ''مشترکہ کہانی'' قرار دیا ہے۔

ان کے مطابق یہ پروڈکشن صرف ایک باحجاب خاتون کی زندگی نہیں بلکہ ایک ایسے معاشرے کی عکاسی ہے جس نے مختلف ادوار میں شدید تضادات کے باوجود اپنے وجود کو برقرار رکھا۔

انہوں نے اسے آزادی، یکجہتی اور ثقافتی تسلسل کی علامت قرار دیا ہے۔

ریاستی نقطہ نظر سے یہ پروڈکشن ''ثقافتی سفارت کاری'' کا حصہ ہے، جس کے ذریعے ترکیہ اپنی نرم طاقت (soft power) کو عالمی سطح پر مضبوط کر رہا ہے۔

لیکن سوال پھر وہی رہتا ہے کہ کیا ہر مشترکہ کہانی واقعی سب کے لیے مشترکہ ہوتی ہے؟

ترک اپوزیشن کا زاویہ

سیکولر اور اپوزیشن حلقے اس ڈرامے کو ایک متوازن تاریخی دستاویز نہیں سمجھتے۔

ان کے مطابق ریاستی میڈیا جب کسی ایک باحجاب خاتون کو مرکزی علامت بنا کر پیش کرتا ہے تو یہ محض ثقافتی انتخاب نہیں رہتا بلکہ سیاسی اشارہ بن جاتا ہے۔

ان کا مؤقف ہے کہ ترکیہ کی جدید تاریخ میں ریاستی اصلاحات، سیکولر ادارے اور فوجی ادوار کو جس طرح دکھایا جاتا ہے، وہ اکثر غیر متوازن ہوتا ہے۔

یہ بحث دراصل اس سوال پر آ کر رکتی ہے کہ تاریخ کون لکھتا ہے؟ اور اسکرین پر کون دکھاتا ہے؟

میڈیا، ریاست اور بیانیہ سازی

ترکیہ میں میڈیا ہمیشہ سے صرف خبر دینے کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ بیانیہ سازی کا ایک اہم ذریعہ رہا ہے۔

TRT جیسے ادارے ریاستی پالیسی اور ثقافتی سمت کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اسی لیے جب کوئی ڈرامہ نشر ہوتا ہے تو وہ صرف تفریح نہیں ہوتا بلکہ ایک پالیسی سگنل بھی بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ پروڈکشنز فوری طور پر سیاسی بحث کا حصہ بن جاتی ہیں۔

سوشل میڈیا: نئی عدالت

آج کے ترکیہ میں سوشل میڈیا وہ جگہ ہے جہاں فیصلے عدالت سے پہلے عوام کی رائے کی صورت میں صادر ہو جاتے ہیں۔

ڈرامے کی ریلیز کے بعد سوشل میڈیا پر واضح تقسیم دیکھی گئی۔

ایک طرف اسے باحجاب خاتون کی جدوجہد کی سچی کہانی قرار دیا گیا جبکہ دوسری طرف اسے نظریاتی پروپیگنڈا کہا گیا۔

یہ تقسیم نئی نہیں، مگر اس بار زیادہ واضح اور زیادہ جذباتی تھی۔

اصل سوال، ترکیہ کی شناخت

کیا ترکیہ ایک مکمل سیکولر ماڈل ہے جو مذہب کو ریاست سے الگ رکھتا ہے؟

یا ایک ایسی ریاست ہے جو اپنی مذہبی اور تہذیبی جڑوں کو دوبارہ دریافت کر رہا ہے؟

مگر اب یہ سوال صرف نظریاتی نہیں رہا۔

یہ اداروں، پالیسیوں، میڈیا اور روزمرہ زندگی میں محسوس کیا جا رہا ہے۔

''Senin Hikâyen:Sule'' دراصل ایک ڈرامہ نہیں بلکہ ایک آئینہ ہے۔

اس آئینے میں کچھ لوگ ایک باحجاب خاتون کی جدوجہد دیکھتے ہیں، کچھ ریاستی نظریات پر سوال اٹھتا دیکھتے ہیں، اور کچھ اپنی کھوئی ہوئی شناخت تلاش کرتے ہیں۔

لیکن سب ایک بات پر متفق ہیں کہ یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اور شاید ترکیہ میں ایسے ڈرامے کبھی ختم نہیں ہوں گے، کیونکہ یہاں مسئلہ صرف ماضی کا نہیں بلکہ حال اور مستقبل کا سوال بھی ہے۔

ISSN # : 3080-9746

اعتماد کا جنازہ

تحریر: نوشی حنیف

میرا نام عائشہ ہے۔ میں نے عالم شباب میں قدم رکھا تو میری شادی ہوگئی۔ بڑی سہانی اور خواب ایسی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا۔ پر مسرت زندگی کا پہیہ گھومتے گھومتے دس برس بیت گئے۔ ان دس برسوں میں، میں نے اپنے ہمسفر کو صرف شوہر ہی نہیں بلکہ اپنی کائنات سمجھ لیا تھا۔ میں ان خواتین میں سے تھی جو اپنے شریک حیات کی ایک مسکراہٹ پر تمام دن نہال رہتی ہیں اور اپنے مزاجی خدا کی معمولی پریشانی پر رات بھر جاگ کر گزار دیتی ہیں۔ شادی کے بعد میری زندگی کا محور مرکز صرف میرا گھر تھا۔ صبح بچوں کی دیکھ بھال، بعد ازاں گھر کے کام کاج اور رات شوہر کی خدمت کے لیے۔

میں نے ان دس برسوں میں اپنی پسند کے ملبوسات تک خریدنے کی ضد نہیں کی تھی۔ کبھی کسی مہنگی چیز کا مطالبہ نہیں کیا کہ شوہر پر مالی بوجھ نہ پڑے۔ میری خوشی اسی میں تھی کہ میرا گھر آباد رہے۔ میرے شوہر اکثر کہا کرتے تھے کہ عائشہ تم جیسی شریکِ حیات ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی اور میں اپنے بارے میں یہ سن کر دل ہی دل میں اللہ تعالی کا شکر بجالاتی تھی کہ مجھے اتنا اچھا شوہر ملا۔ اللہ تعالی نے اپنی خاص عطا سے دو بچوں سے ہمارے انگھن کو بھر دیا جس سے میری ذمے داریوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس دوران مجھے کبھی بھی اپنے شوہر پر شک نہیں ہوا۔

لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بدلے بدلے سے نظر آنے لگے۔ انہوں نے اکثر گھر دیر سے آنے کو اپنا معمول بنا لیا۔ صرف یہی نہیں بچوں کے ساتھ بھی ان کا پہلے جیسا سلوک نہیں رہا تھا۔ میرے استفسار پر وہ یہی عزر پیش کرتے کہ دفتر میں کام کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ در پردہ ان کے دل میں کیا چل رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر اپنے خاوند کو ہر لحاظ سے قابل اعتماد ساتھی سمجھتی تھی۔ میں اسے اپنی بدنصیبی کی کہوں گی کہ ایک رات ایسی بھی آ گئی جس نے میری زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ رات دراصل میرے اعتماد کا آئینہ ٹوٹ جانے کی تاریک شب تھی۔ ایک عائشہ وہ تھی جو اس رات سے پہلے تھی اور ایک وہ عائشہ تھی جس کے اعتماد کی دیوار آج ریت کی طرح زمیں بوس ہوتی نظر آ رہی تھی۔

رات کے تقریبا دو بج رہے تھے اور بچے سو چکے تھے۔ گھر میں ہر سو خاموشی تھی کہ اچانک میرے خاوند کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر بیدار ہوئی اور یہ سوچ کر اپنے شوہر کا موبائل پکڑا کہ ان کی کوئی ضروری کال ہو تو انہیں جگا کر بتا دوں مگر جونہی میری نظر اسکرین پر پڑی تو "میری جان" کے عنوان سے ایک نام جگمگا رہا تھا۔ پہلے مجھے محسوس ہوا شاید میری آنکھیں دھوکہ دے رہی ہیں یا ان کا کوئی گہرا دوست مذاق نہ کر رہا ہو یا مجھے غلط فہمی نہ ہو رہی ہو مگر میرے پاؤں تلے سے زمین تب سرکنا شروع ہوئی جب ایک میسج ایا کہ جان اج بھی تمہاری اواز سنے بغیر نیند نہیں ارہی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل کھولا جو شاید مجھے نہیں کھولنا چاہیے تھا مگر اب سچ میرے سامنے تھا۔ میسجز ایک کے بعد ایک کھلتے گئے اور میری سانسیں گھٹتی گئیں۔

میسجز کے طویل سلسلے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ صرف چند دنوں یا مہینوں کی کہانی نہیں تھی، یہ تعلق یقیناً کئی سال پرانا تھا۔ وہ ناگن میرے شوہر نامدار کی ہر وہ بات جانتی تھی جو میں نہیں جانتی تھی۔ چونکہ وہ میرے شوہر کی پسند تھی اس لیے ان کی سب خامیوں اور کمزوریوں تک سے واقف لگتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ میرے شوہر کا وہ وقت اپنے نام کرنا چاہتی تھی جو دراصل میرا اور میرے بچوں کا حق تھا۔ یہ سب معلوم ہونے کے بعد مجھے اپنی زندگی بے مقصد نظر آنے لگی تھی۔ میں وہ پوری رات سو نہیں سکی، بیٹھی صرف یہ سوچتی رہی کہ آخر مجھے کس جرم کی سزا ملی ہے، میں جسے اپنی کل کائنات سمجھتی تھی اس نے آخر میرے اعتماد کا جنازہ کیوں کالا ہے؟ میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں مگر میں روئی، نہ شور مچایا۔

اس لئے کہ بعض اوقات درد اتنا بڑھ جاتا ہے کہ انسو بھی اس کا مداوا نہیں کر پاتے۔ صبح ہوئی تو میں نے موبائل اپنے خاوند کے سامنے رکھ دیا۔ میرے شوہر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ پہلے انکار، پھر بہانے، پھر صفائیاں اور اخر کار خاموش ہو گیا۔ اس لئے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ وہ صرف دلائل کے فریب سے اپنا دفاع کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا جن سے میں اس لیے مطمئن نہیں ہو رہی تھی کہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی تمام تفصیلات جان چکی تھی۔ مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے، چاہے ہم سفر ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد کئی ماہ ہمارے گھر میں خاموشی کا راج رہا مگر اعصاب کی جنگ رہی۔ بچے ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتے تھے مگر کچھ نا کچھ محسوس ضرور کرتے تھے۔ بڑا بیٹا اکثر پوچھتا امی اپ پہلے کی طرح ہنستی مسکراتی کیوں نہیں مگر میرے پاس بیٹے کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو میری انکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بن چکے تھے، چہرے پر تھکن نمایاں تھی اور دل میں ایک قبرستان سا اباد ہو چکا تھا۔ اسی روز میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی باقی زندگی کسی کے دھوکے کی سزا بن کر نہیں گزار سکتی۔ میں نے اپنے بچوں اور خود کو سنبھالا اور زندگی کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا، بالکل بھی اسان نہیں تھا مگر انسان کو زندہ رہنے کے لیے کبھی ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بھی حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

آج اس واقعے کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ میرے بچے عالم شباب کو پہنچ چکے ہیں۔ اب میں بھی پہلے والی عائشہ نہیں رہی۔ میں نے خود کو سنبھال لیا ہے مگر بھولی کچھ نہیں، مجھے آج بھی سب کچھ یاد ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ حالات نے مجھے بہت کچھ سیکھا دیا ہے۔ میرے شوہر نے بہت کوشش کی۔ کئی بار معافی مانگی۔ رشتے کو بچانے کی التجا تک کی مگر میرا زخم ایسا تھا کہ آج بھی بھرنے کا نام نہیں لے رہا۔ اس لئے کہ اعتماد کا شیشہ جب ٹوٹ جائے تو جڑتا نہیں۔ اعتماد کا جنازہ جب آٹھ جاتا ہے تو گھروں میں ویرانیاں بسیرا کر لیتی ہیں۔ اج جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو ایک بات ضرور سمجھ میں اتی ہے کہ دھوکہ صرف ایک غلطی ہی نہیں ہوتا یہ کسی دل میں برسوں سے بسے اعتماد کا جنازہ بھی نکال دیتا ہے۔ میں زندہ ہوں اپنے لئے، اپنے جگر گوشوں کے لیے اور لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ دوسروں سے محبت ضرور کریں مگر لوگوں سے اپنی قدر کرانا بھی بہت ضروری ہے کہ انسان کی عزت نفس نہ رہے تو جینا کیسا؟ رشتے تب نہیں ٹوٹتے جب کوئی گھر چھوڑ جاتا ہے رشتے تب ٹوٹتے ہیں جب اعتماد کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

ISSN # : 3080-9746

کویت: پاک ڈونرز کا اعزاز

سنٹرل بینک کویت کی تسلیم شدہ 10 سرکردہ تنظیموں میں تیسری پوزیشن

رپورٹ: محمد عمر

کویت: کویت پاک ڈونرز کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا ہے کہ اس نے کویت کی وزارت صحت کے تحت قائم کویت سنٹرل بلڈ بینک کی جانب سے تسلیم شدہ 10 سرکردہ تنظیموں میں تیسری پوزیشن حاصل کر لی ہے جو پاکستان کیلئے بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ پاک ڈونرز کی انتظامیہ کی طرف سے خون کے عطیات جمع کرانے والے تمام بہن بھائیوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ان کے ہیروز ہیں جنہوں نے انسانی جانیں بچانے کیلئے بے مثال ایثار، ہمدردی اور خدمت انسانیت کا مظاہرہ کیا۔ یہ اعزاز تمام ڈونرز، رضا کاروں، معاون حضرات اور پاک ڈونرز کے تمام ارکان کی محنت، لگن اور جذبہ خدمت انسانیت کا نتیجہ ہے اور وہ ان سب کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد اور خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

ISSN # : 3080-9746

کویت: TASTES OF PAKISTAN سفارت خانہ میں تاریخی ثقافتی پروگرام کا انعقاد

40 سے زائد سفیروں اور سفارتکاروں کی شرکت: روایتی پاکستانی کھانوں اور ثقافتی ورثہ کی نمائش

کویت (محمد عمر میڈیا کوریج: عمران ظفر) پاکستانی سفارتخانہ میں گذشتہ روز Tastes of Pakistan,, پاکستان کے ذائقے،، کے عنوان سے بھرپور چٹ پٹے پکوانوں اور ثقافتی ورثہ کا جشن منانے کا یہ ایک یادگار اور تاریخی پروگرام تھا۔ مہمانوں نے چٹ پٹے اور مزیدار پاکستانی پکوانوں کا لطف اٹھایا جس میں کے سفیر عزت مآب ڈاکٹر ظفر اقبال نے اپنے خیر مقدمی خطاب میں کہا کہ یہ تاریخی ثقافتی ایونٹ ہے جس میں پاکستانی سفارتخانہ میں ایک یادگار ثقافتی تقریب کا

ایک سفارتی اور ثقافتی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں برادر ممالک کے تقریباً 40 سفیروں اور سفارتکاروں کے علاوہ کمیونٹی کی نمایاں شخصیات نے بھی شرکت کی، اس موقعہ پر پاکستان کے مختلف علاقوں کے چٹ پٹے کھانے پیش کئے گئے اور ثقافتی اشیاء کی نمائش بھی کی گئی۔ پاکستان کے پاکستان کے مختلف ذائقوں، مہمان نوازی اور عظیم ثقافتی روایات کی جھلک نظر آئی۔ ثقافتی فن پاروں کی نمائش اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمت اللہ علیہ کی تصویری جھلکیاں اور پاکستان کی تاریخ، جغرافیہ اور مختلف مذاہب کے تنوع کو اجاگر کر رہی تھیں۔ اس سے قبل پاکستان اہتمام کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ برادر ممالک کے سفیروں اور سفارتکاروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ برادر ممالک کے سفیر اور سفارتکار بھی پاکستانی مہمانوں میں گھل مل گئے اور ان کے ساتھ تصاویر بنواتے رہے۔

ISSN # : 3080-9746

فتحِ استنبول، 29 مئی 1453ء ترک عثمانیوں کی عظمتِ رفتہ

تحریر: شبانہ ایاز

29 مئی 2026ء۔ استنبول کی فضا میں جوش و خروش، ترک پرچموں کی لہریں اور تاریخ کی گونج ایک ساتھ مل کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

فتحِ استنبول کی 573 ویں سالگرہ کی تقریبات دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا جیسے 1453ء کا وہ تاریخی دن دوبارہ زندہ ہو گیا ہو۔ ہر طرف وہی عقیدت، وہی فخر اور وہی قومی جذبہ نظر آ رہا تھا جو صدیوں پرانی عثمانی عظمت کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

استنبول کی تاریخی شاہراہوں، باسفورس کے کناروں، آیا صوفیہ کے صحن، فاتح مسجد، دولما باغچے اور ایوب سلطان کمپلیکس تک جہاں بھی نگاہ جاتی، ہزاروں لوگ ترک پرچم لہراتے، آنکھوں میں فخر لیے گھوم رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، نوجوان — سب ایک ہی جذبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ فضا میں اذانیں، تلاوت کی آوازیں اور تاریخی یادوں کی گونج ایک دوسرے سے مل کر دل کو چھو رہی تھی۔

استنبول میں صبح سویرے ہی ہالیچ کانگریس سینٹر کے آس پاس کا ماحول دیکھنے والا تھا۔ جہاں پر مرکزی تقریب ''فتحِ استنبول سے فتحِ قلوب'' جاری تھی۔ چاروں طرف سخت سیکورٹی کے باوجود عوام کا سیلاب روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ ترکیہ کے مختلف صوبوں سے لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ خواتین روایتی لباس میں، مرد فاتح سلطان کی طرز کے لباس میں اور بچے چھوٹے پرچم لے کر دوڑتے پھر رہے تھے۔

جب صدر رجب طیب ایردوان خطاب کے لیے اٹھے تو پورا ہال تالیاں بجاتا کھڑا ہو گیا۔ ان کے الفاظ دل تک اتر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ 573 برس قبل حاصل ہونے والی یہ فتح آج بھی ترک قوم کے دلوں میں زندہ ہے۔ استنبول ہمیشہ سے تہذیب، علم، رواداری اور اسلامی تشخص کا مرکز رہا ہے۔ کسی بھی کوشش کو قبول نہیں کیا جائے گا جو اس شہر کی تاریخی شناخت کو کمزور کرے۔

جب آیا صوفیہ کا ذکر ہوا تو ہال میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آنکھیں نم ہو گئیں اور سینوں میں فخر بھر گیا۔

آیا صوفیہ میں ایردوآن کی تلاوت — دل چھو لینے والا لمحہ

آیا صوفیہ کے صحن میں پہنچتے ہی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ صبح کی تقریب میں صدر رجب طیب ایردوان کی موجودگی اور ان کی قرآن مجید کی تلاوت نے ماحول کو روحانی جوش سے بھر دیا تھا۔

2020 میں دوبارہ مسجد بننے والی اس عظیم عمارت میں ہزاروں نمازی ایک ساتھ کھڑے تھے۔ اللہ اکبر کے کلمات گونج رہے تھے اور لگ رہا تھا جیسے فاتح سلطان محمد ثانی کی روح موجود ہو۔

573 برس پہلے اسی جگہ انہوں نے فتح کے بعد نماز ادا کی تھی۔ تاریخ اور حال کا یہ امتزاج دیکھ کر جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔

بعد میں وزیر داخلہ مصطفیٰ چیفتجی فاتح سلطان محمد ثانی کے مقبرے پر پہنچے۔ حافظِ قرآن کی حیثیت سے ان کی سورۃ فتح کی تلاوت نے سب کو متاثر کر دیا۔

''اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا اور ایک قریب کی فتح عطا کی...''

سورہ فتح کی آیات مقبرے کے اندر گونج رہی تھیں۔ لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو، چہروں پر عقیدت اور دلوں میں عثمانی ترکوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ فتحِ استنبول صرف کتابوں میں نہیں بلکہ اس قوم کے خون میں دوڑ رہی ہے۔

استنبول کی جگمگاتی شان — ماضی اور حال کا حسین امتزاج

فتحِ استنبول کی سالگرہ پر تاریخی عمارتیں ترک پرچموں اور خصوصی روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ فاتح مسجد، ایوب سلطان کمپلیکس، توپ قاپی محل اور روم محمد پاشا مسجد — سب ایک دوسرے سے مل کر عظمت کی داستان سنا رہے تھے۔ باسفورس کے کنارے لوگ بیٹھے تھے، کشتیاں چل رہی تھیں اور فضا میں تاریخی فخر کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سے زائد آبادی والا یہ شہر آج بھی یورپ اور ایشیا کو جوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جدید انفراسٹرکچر، عالمی معیار کی جامعات، سیاحت کا مرکز اور

ISSN # : 3080-9746

معاشی طاقت — سب کچھ موجود ہے۔ لوگوں کے چہروں پر فخر صاف نظر آ رہا تھا جب وہ بتاتے تھے کہ ترکیہ رجب طیب ایردوان کی حکمرانی میں مسلم دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن چکا ہے۔ حجم 1.64 ٹریلین ڈالر — انڈونیشیا دوسرے، سعودی عرب تیسرے، یو اے ای چوتھے، ملائیشیا پانچویں، بنگلہ دیش چھٹے اور پاکستان ساتویں نمبر پر ہے۔

رجب طیب ایردوان کا 1994 میں استنبول کا میئر بننا اور شہر کو مسائل کے گڑھ سے نکال کر جدید بنانا آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ پانی کی قلت، آلودگی، قرضوں کا بوجھ — سب ختم کر کے انہوں نے استنبول کو ترکیہ کی معیشت، ثقافت، تعلیم اور سیاحت کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا۔ صدر بننے کے بعد پورے ملک کو اسی عزم اور بصیرت سے آگے بڑھایا۔

فتحِ قسطنطنیہ کی یاد — 53 دن کا محاصرہ اور نوجوان سلطان محمد کا معجزہ

تقریبات کے دوران مورخین اور عام لوگوں سے جب بات ہوتی تو بار بار ایک بات سامنے آتی۔ 29 مئی 1453ء کو صرف 21 سالہ سلطان محمد ثانی نے 53 دن کے سخت محاصرے کے بعد قسطنطنیہ فتح کیا۔ بازنطینی سلطنت کا خاتمہ ہوا جو ایک ہزار ایک سو سال سے زائد قائم تھی۔ جدید توپ خانے، جنگی حکمت عملی، جہازوں کو خشکی پر گھسیٹ کر گولڈن ہارن میں داخل کرنے کا معجزہ اور سلطان کی ذاتی قیادت — سب کچھ حیرت کا باعث تھا۔

فتح کے بعد سلطان محمد فاتح نے شہر کو دوبارہ آباد کیا۔ 167 سے زائد مساجد، تعلیمی ادارے، کتب خانے اور سماجی مراکز قائم کیے۔ ایوب سلطان کمپلیکس، فاتح مسجد، توپ قاپی محل — یہ سب اسی دور کی یادگار ہیں۔ آیا صوفیہ کو مسجد بنانا اس عظیم فتح کی سب سے نمایاں علامت بن گیا جو آج بھی اسلامی دنیا کی روحانی شان ہے۔

ترک قوم کا جوش و جذبہ — ایک زندہ احساس

استنبول کی شاہراہوں پر لوگوں کا جوش دیدنی تھا۔ سیمینارز، تاریخی نمائشیں، ثقافتی پروگرامز اور یادگاری اجتماعات — سب کچھ فتحِ استنبول کو صرف ماضی نہیں بلکہ حال کا حصہ بنا رہے تھے۔ قدیم فصیلوں کے قریب لوگ فاتح سلطان کی حکمت عملی اور بہادری کی باتیں کر رہے تھے۔ عوام میں قومی جذبہ اتنا شدید تھا کہ ہر چہرے پر عثمانی ترکوں کی یاد تازہ نظر آ رہی تھی۔

ترکیہ کے دیگر شہروں میں بھی تقریبات ہوئیں مگر استنبول کی شان الگ تھی۔ باسفورس کے دلکش مناظر، تاریخی مساجد، جدید عمارتیں — سب ایک ساتھ جگمگا رہے تھے اور دل کو ایک عجیب سی طمانیت دے رہے تھے۔

عظمت کا تسلسل — ماضی سے حال اور مستقبل تک

فتحِ استنبول کی یہ سالگرہ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ سلطان محمد فاتح کا عزم، بصیرت اور قیادت آج رجب طیب ایردوان کی شکل میں زندہ ہے۔ استنبول کے میئر سے لے کر صدر بننے تک کا سفر ترکیہ کی کامیابی کی زندہ مثال ہے۔ معیشت کی ترقی، انفراسٹرکچر، عسکری طاقت اور بین الاقوامی حیثیت — سب فتحِ استنبول کی اسی عظمت کا تسلسل ہیں۔

ترک قوم کا یہ جوش، عقیدت اور خود اعتمادی دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ عثمانیوں کی عظمتِ رفتہ آج بھی ترکیہ کی شان اور طاقت ہے۔ مسلم دنیا کے لیے یہ ایک روشن مثال ہے کہ ماضی کی عظمت کو یاد رکھتے ہوئے حال کو کیسے سنوارا جا سکتا ہے۔

استنبول کی گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک بات بہت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی عظمت رفتہ کو پوری آب و تاب سے زندہ اور اصل حالت میں رکھا ہوا ہے۔

فتح قسطنطنیہ/ استنبول صرف ایک شہر کی فتح نہیں، دلوں کی فتح ہے جو 573 برس گزرنے کے باوجود آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔

ترک قوم کی یہ عقیدت اور جوش و خروش دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ تاریخ صرف کتابوں میں نہیں بلکہ استنبول و دیگر شہروں میں اپنی اصل حالت میں بھی زندہ رہتی ہے۔

فتحِ استنبول کی 573ویں سالگرہ

نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ عثمانی ترکوں کی عظمت اب بھی ترکیہ کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہے۔ صدر رجب طیب ایردوان کی قیادت میں یہ قوم ماضی سے جڑے ہوئے مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ استنبول آج بھی تہذیبوں کا مرکز، علم کا گہوارہ اور اسلامی تشخص کی زندہ علامت ہے۔۔

ISSN # : 3080-9746

اِنتہائی نفیس شخصیت کے حامل اختر شمار

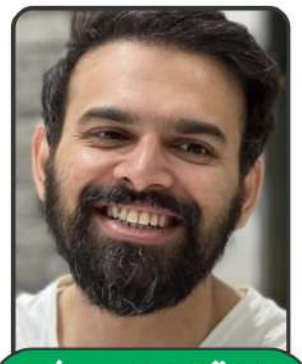

تحریر و تحقیق: علی حیدر شیخ

ڈاکٹر اختر شمار اپریل 1960ء کو پیدا ہوئے، آپ کا آبائی تعلق گاؤں سہال نزد چکری ضلع راولپنڈی سے تھا، ان کے والد گرامی بہت عرصہ پہلے ملتان میں آباد ہو گئے تھے، ڈاکٹر اختر شمار شاعر، ماہر تعلیم، کالم نگار، ایف سی یونیورسٹی، لاہور شعبہ اردو کے صدر تھے۔ اس سے پہلے وہ جامعہ عین شمس اور جامعہ الازہر میں بھی تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

۔ ان کا شمار موجودہ دور کے نامور پاکستانی اردو شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ دو درجن کتب کے مصنف تھے۔ کچھ عرصہ قبل ان کا شعری کلیات اختر شماریاں کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کا تدریسی و تخلیقی سفر تین دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ 2003 میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی نگرانی میں حیدر دہلوی: احوال و آثار کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی۔ 2003 ہی میں انھوں نے فورمین کرسچین کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے جوائن کیا۔ 2008 سے 2012 تک مصر کی جامعہ عین الشّمس اور جامعہ الازہر کی پاکستان چیئر پر خدمات انجام دیں۔ انھیں پاکستان کا پہلا ادبی اخبار بجنگ آمد جاری کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کی دیگر کتابوں میں روشنی کے پھول کسی کی آنکھ ہوئے ہم یہ آغاز محبت ہے جیون تیرے نام ہمیں تیری تمنا ہے آپ سا کوئی نہیں تمھی میری محبت ہو دھیان عاجزانہ (اردو شاعری) اکھیاں دے وچ دل میلہ چار دیہاڑے (پنجابی شاعری) پنجابی ادب رنگ بھرتری ہری ایک عظیم شاعر میں بھی پاکستان ہوں ہم زندہ قوم ہیں لاہور کی ادبی ڈائری موسیٰ سے مُرسی تک وغیرہ (نثری تحریریں) شامل ہیں۔ ان کے کلام کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

ذرا سی دیر تھی بس اک دیا جلانا تھا
اور اس کے بعد فقط آندھیوں کو آنا تھا
میں گھر کو پھونک رہا تھا بڑے یقین کے ساتھ
کہ تیری راہ میں پہلا قدم اٹھانا تھا
وگرنہ کون اٹھاتا یہ جسم و جاں کے عذاب
یہ زندگی تو محبت کا اک بہانہ تھا
یہ کون شخص مجھے کرچیوں میں بانٹ گیا
یہ آئنہ تو مرا آخری ٹھکانہ تھا
پہاڑ بھانپ رہا تھا مرے ارادے کو
وہ اس لیے بھی کہ تیشہ مجھے اٹھانا تھا
بہت سنبھال کے لایا ہوں اک ستارے تک
زمین پر جو مرے عشق کا زمانہ تھا
ملا تو ایسے کہ صدیوں کی آشنائی ہو
تعارف اس سے بھی حالانکہ غائبانہ تھا
میں اپنی خاک میں رکھتا ہوں جس کو صدیوں سے
یہ روشنی بھی کبھی میرا آستانہ تھا

میں ہاتھ ہاتھوں میں اس کے نہ دے سکا تھا شمارؔ
وہ جس کی مٹھی میں لمحہ بڑا سہانا تھا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سبھی کچھ خوبصورت ہے جہاں پر
ہمیں واپس بھی جانا ہے کیا کریں
اس کے نزدیک غمِ ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں
چار دن رہ گئے میلے میں مگر اب کے بھی
اس نے آنے کے لیے خط میں لکھا کچھ بھی نہیں
کل بچھڑنا ہے تو پھر عہد وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغازِ محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چُپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلا کچھ بھی نہیں
اے شمارؔ آنکھیں اسی طرح بچھائے رکھنا
جانے کس وقت وہ آ جائے پتا کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جانے کس دیس جا بسے اختر
ہائے وہ لوگ خوش کلام سے لوگ
وقت نے تو یہی سکھایا شمار
آج ہے آج؛ کل نہیں کوئی
جانے سے پیش تر جو بتایا نہیں اُسے
وہ سو رہا تھا میں نے جگایا نہیں اسے
میں کیا کہوں کے کیسی تھی وہ شامِ الوداع
بس دیکھتا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ بلایا نہیں اسے
میں گزرتا تو وہاں جاں سے گزرتا چُپ چاپ
یہ ہوا کیسے مدینے سے گذر جاتی ہے
آپ کی ہی یاد ہو اب زندگی
اب مجھے خود کو بھلانا چاہیے
کہاں رکے ہیں اب بھی یزیدیوں کے ظلم و ستم
ہمارے سامنے کشمیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی کہانی ہے
دیکھے کسی کی ایک جھلک اور اُس کے بعد
پہروں کسی کو بیٹھ کے سوچا کرے کوئی
کاغذ پہ یہ اشعار ہیں یا خون کے چھینٹے
یا رنگ پہ آیا ہُوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فن کار کا دکھ ہے
روز منایا کرتے تھے
اک تہوار محبت تھی
بیٹھا رہے تو سامنے میرے اسی طرح
دل چاہتا ہے شام سہانی نہ ختم ہو
میرے لفظوں کی سادگی پہ نہ جا
شعر کی تازگی۔۔۔۔۔۔۔ تعارف ہے
ریزہ ریزہ ہونے لگا ہوں میں ہر پل
کھا جائیں گے مجھ کو پاکستان کے دکھ
مت کسی کا گلہ کرو بھائی
سب پہ راضی رہا کرو بھائی
میرا دروازہ کھولتا تھا کوئی
یا کہ دستک پہ بار بار تھا میں
دل جھاڑ ذرا اور ہمیں ڈھونڈنے والے
ہوں گے کسی تصویر پرانی میں کہیں ہم
عدالت ہی لگانی ہے تو ان جلوؤں کو بھی پوچھو
قصور ان کا بھی ہوگا مجھ کو دیوانہ بنانے میں
ایک جیسے تھے سبھی اس شہر میں
مجھ کو سب سے مختلف ہونا پڑا
تیری قُربت میں کبھی سوچا نہیں تھا میں نے
تیری فُرقت کا زمانہ بھی مجھے دیکھنا تھا
ایک تجھ پر اثر نہیں کوئی
جھوم اٹھے مرے کلام سے لوگ
میں بہت جلد بھنور میں تجھے یاد آؤں گا
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کر کے
تجھے میں مل نہ پایا وقتِ رخصت
جیوں گا جب تلک یہ غم رہے گا

ISSN #: 3080-9746

گرمی دانے (پت)

حکیم حارث نسیم سوہدروی

ہمارے ہاں خاص کر خطہ پنجاب میں ماہ جون جولاء اور اگست میں جھلسا دینے والی گرمی ہوتی ھے اور انسان تو درکنار پرند اور چرند بھی اذیت محسوس کرتے ھیں شدت گرمی کے باعث پسینہ کثرت سے آتا ھے اور پانی بذریعہ پسینہ خارج ہوتا ھے جس سے پیاس بہت لگتی ھے جس سے جسم کی قوتوں اور ارواح متاثر ہوتے ھیں جس کی وجہ سے اعمال وافعال میں سستی چھا جاتی ھے اور جسم میں حرارت بڑھ جاتی ھے۔یہاں تک کہ بعض افراد میں زبان خشک ہوکر تالو سے جالگتی ھے ایسا محسوس ہوتا ھے کہ ھونٹوں کی سرخی غائب ہوکر سیاھی اور بے رونقی اجاتی ھے پسینہ کی کثرت جسم کو شرابور کردیتی ھے جب جس کی حالت ہو تو اس میں اضافہ ہوجاتا ھے اس کی وجہ سے جلد کی سب سے بیرونی جھلی کے نیچے آبی رطوبات کے چھوٹے چھوٹے قطرے موتیوں کی طرح اکٹھے ہوکر گرمی دانوں کا سبب بنتے ھیں اگر ان دانوں کو دبایا جائے تو درد، جلن اور تکلیف ہوتی ھے اگر جس ہو یا شدید گرمی ہو تو ان دانوں میں بہت جلن اور چبھن ہوتی ھے جس سے بہت اذیت ہوتی ھے ان دانوں کو پت بھی کہا جاتا ھے جب ان دانوں کا اوپر والا حصہ الگ ہوجائے تو انفیکشن کے باعث پھوڑے پھنسیوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اس طرح یہ دانے بہت تکلیف کا باعث بنتے ھیں۔دیکھا یہ گیا ھے کہ چھوٹے بچے زیادہ متاثر ہوتے ھیں کیونکہ وہ گرمی کا اثرات جلد قبول کرتے ھیں اس لئے کہ ان کا مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔جن کو یہ دانے نکلتے ھیں وہ ان کی وجہ سے شدید بے چین اور الجھن کا شکار ہوجاتے ھیں کیونکہ یہ دانے شدید خارش چبھن اور گھبراہٹ پیدا کرتے ھیں اس کی وجہ سے رات بھر سو نہیں سکتے اور روتے رہتے ھیں اگر ہوا چلتی رہے بجلی کا پنکھا ائیر کولر یا ائیر کنڈیشنڈ میسر ہو تو پھر سکون رہتا ھے بعض افراد اور خاندانوں بہت کم اور بعض میں یہ شکایت بہت زیادہ ہوتی ھے اس کمی بیشی کا تعلق ان کے طرز زندگی اور خوراک سے ہوتا ہے مثال کے طور پر بعض لوگ کھانے می گرم اشیا جن میں مرچ مصالحہ جات انڈا مچھلی گوشت کا زیادہ استعمال کرتے ھیں جبکہ بعض لوگ تنگ تاریک مکانات میں رہائش رکھتے ھیں اور غسل کی سہولیات کم ہوتی ھیں اس طرح جو لوگ ہوادار ٹھنڈے اور پڑفضا مقامات پر رہتے ہیں ان کو یہ شکایت کم ہوتی ھے۔اگر آپ گرم مقامات والے علاقوں میں جائیں تو وھاں پر یہ شکایت زیادہ ہوتی ہے۔

جب جلد سے پسینہ کا اخراج کم ہوتا ھے اور یہ آبی قطرے جلد کے نیچے جمع ہوکر دانوں کی صورت ظاہر ہوتے ھیں جنھیں ھم گرمی دانوں کا نام دیتے ھیں ان میں شدید جلن درد اور اذیت ہوتی ھے کبھی ایک جگہ پر بہت زیادہ ہوتے ھیں تو کبھی دوسری طرف فاصلے پر کم ہوتے ھیں کبھی ایسا بھی ہوتا ھے کہ ایک جگہ کم ہوتے تو دوسری جگہ زیادہ بن گئے کبھی سرخی مائل تو کبھی سفید ہوتے ھیں۔عام طور پر کمر، گردن، اور بغلوں کے درمیان زیادہ ہوتے ہیں۔

*بچاو کی تدابیر

* گرم اور محرک اشیا سے پرہیز کیا جائے
* گرمی کی شدت سے بچا جائے اس طرح گرمی کم ہونے سے پسینہ کم آنے سے ان دانوں سے بچا جاسکتا ہے
*روزانہ صبح وشام غسل کریں تاکہ جسم میں کچیل سے محفوظ رکھے اور مسامات کے بند ہونے کا امکان کم رہے
*ریشمی
یا دیگر مصنوعی ریشہ دار اشیا والے کپڑے بھی حساسیت
کا باعث بن سکتے ھیں ان سے احتیاط کی جائے
غذا میں گھیا توری مونگ کی دال اور ٹماٹر مفید ہیں
*ام کھانے کی صورت میں بعد میں کچی لسی ضرور پئیں تاکہ اس کے نتیجے میں ہونے والی گرمی کے اثرات سے بچا جاسکے
*دھوپ میں باھر نکلنے سے احتیاط کی جائے
* پسینہ زیادہ آنے کی صورت میں تولیہ یا سوتی کپڑے سے صاف کریں۔
* کمزور اشخاص اپنی صحت کی طرف توجہ دیں
*موسم کے مطابق انڈا مچھلی اچار
اور چاے اور کافی کا استعمال نہ
کریں کیونکہ یہ خون میں حدت پیدا کرتی ھیں
*اس موسم میں الو بخارا انار، جامن، تربوز، لیموں کی سکنجبین، اور ٹھنڈی اشیا کا استعمال مفید ھے
*ستو کا شربت

شدت گرمی کی وجہ سے جب پیاس کی شدت ہوتی ھے تو لوگ ٹھنڈے مشروبات سے پیاس بجھاتے ھیں بازار میں رنگا رنگ مشروب دستیاب ہوتے ھیں مصنوعی مشروبات جو ایسیڈز سے بنتے ھیں ان میں گیس ہوتی ھے ان کا استعمال گردوں کو نقصان دیتا ھے اس موسم میں گرمی کے اثرات سے محفوظ رھنے کے لئے اور پیاس بجھانے کیلئے یک اچھا اور سستا قدرتی مشروب شکر ملا ستو کا شربت ھے جو ھمارے پیارے نبی کو بہت مرغوب رھا ھے اور رسول اکرم عام طور پر روزہ ستو کے شربت سے افطار فرماتے تھے اس شربت سے نہ پیاس ختم ہوجاتی ھے بلکہ غذاء کمی بھی رفع ہوتی ھے اور جسم میں پانی کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ستو کا شربت پیاس کو تسکین دیتا طبعیت کو فرحت بخشتا ھاتھ پاوں کی جلن کو ختم کرتا پیشاب کی جلن کو ختم کرتا اور گرمی سے ہونے والے عوارضات سے بچاتا ھے

ستو ایک قسم کا آٹا ھے جو مختلف قسم کی گندم اور جو سے تیار ہوتا ھے پھر اس آٹے کو شکر ملا کر شربت کی صورت پیا جاتا ھے۔چند سال قبل تک یہ ھمارے خطہ پنجاب کا مرغوب شربت تھا جب لو چلتی تو لوگ شکر ملا ستو کا شربت پیتے تھے اور موسمی عوارضات سے محفوظ رہتے تھے یہ لزیز ہونے کے علاوہ شدت گرمی کا توڑ بھی تھا اور اس موسم کے امراض کا علاج بھی ھے اب یہ شھروں میں ریڑھیوں پر یہ ملتا ھے مگر جدید مشینی زندگی اور مصنوعی لوازمات کے باعث یہ روایت اور ثقافت دم توڑ رہی ھے ان نسل تو ستوں کے نام سے بھی ناآشنا ہوتی جارھی ھے ھر طرف مصنوعی مشروبات کی بھرمار ھے پھر الیکٹرانک میڈیا سے اس طرح تشہیر

کی جاتی ھے کہ یہ ایسیڈز اور گیسز والے مشروبات جو کہ مضر صحت بھی ھیں نئی نسل کے مرغوب مشروب بن چکے ھیں اور ھم فطرت سے دور ہوکر صحت کے مسائل کا شکار ھو رھے ھیں۔ستو میں کثیر مقدار میں فائبر ھے جو قبض کشا اور جسم سے کولیسٹرول کی مقدار نارمل کرتا ھے یورک ایسڈ ختم کرتا ھے اور گرما موسم کے امراض گرمی دانے، پیاس لگنا میں مفید ھے لہذا کولا مشروبات کو ترک کرکے قدرتی مشروبات کا استعمال کریں اور گرمی کے عوارضات سے محفوظ رھیں یہ مشروب غذا بھی ھے اور علاج بھی ھے فطرت کبھی غلط نہیں ہوسکتی فطرت کے سارے میں انسان کے لئے عافیت ھے فطرت سے انسان کبھی جنگ نہیں جیت سکتا۔اس لئے اگر آپ موسم گرما کی شدت گرمی سے والے امراض سے بچنا چاہتے ھیں تو اس موسم میں ستو کے شربت اور لیموں کی سکنجبین کا استعمال ضرور کریں۔

ISSN # : 3080-9746

A Project By
ETIMAAD اعتماد
PROPERTY NETWORK

ETIMAAD SIGNATURE HOMES

03 MARLA

ETIMAAD *Signature* HOMES

3 YEARS INSTALLMENT PLAN

Booking	Confirmation	Monthly Installment	Digging	2nd Slab	Bi-Annual	Possession	Total price
1,200,000	1,200,000	80,000	1,200,000	1,500,000	290,000	2,280,000	12,000,000

MARYAM TOWN

ISSN # : 3080-9746

منشیات کی روک تھام کے عملی اقدامات

ڈاکٹر مفتی احمد رضا

یہی وہ راستہ ہے جس سے ہم اپنی نسلوں کو اس تباہ کن لعنت سے بچا سکتے ہیں۔ منشیات کی روک تھام کے سلسلے میں خاندان اور خصوصاً والدین کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ بچہ اپنی ابتدائی تربیت گھر ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول پرسکون، دینی اقدار سے ہم آہنگ اور باہمی اعتماد پر مبنی ہو تو بچے میں خود بخود مثبت شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر گھر میں بے توجہی، جھگڑے، یا جذباتی فاصلے موجود ہوں تو نوجوان ذہنی طور پر غیر محفوظ ہو جاتا ہے، اور یہی عدم تحفظ اسے غلط راستوں کی طرف دھکیل سکتا ہے۔

والدین کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم کریں۔ صرف حکم دینے یا ڈانٹنے سے تربیت مکمل نہیں ہوتی بلکہ بچوں کی بات سننا، ان کے مسائل سمجھنا اور ان کی ذہنی کیفیت سے آگاہ رہنا بھی ضروری ہے۔ آج کے دور میں جب بیرونی اثرات بہت زیادہ مضبوط ہو چکے ہیں، والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا پہلے سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

بچوں کے دوستوں کی صحبت پر نظر رکھنا بھی والدین کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اکثر نوجوان غلط دوستوں کی وجہ سے منشیات کی طرف مائل ہوتے ہیں، اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ سختی کے بجائے حکمت کے ساتھ بچوں کے سماجی حلقے کو سمجھیں اور رہنمائی فراہم کریں۔ اسی طرح موبائل فون، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے استعمال پر بھی غیر محسوس طریقے سے نگرانی ضروری ہے تاکہ بچے غیر اخلاقی یا نقصان دہ مواد سے محفوظ رہ سکیں۔

اسلامی تعلیمات میں بھی والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص اپنے ماتحتوں کے بارے میں ذمہ دار ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ والدین کی ذمہ داری صرف خوراک اور تعلیم فراہم کرنا نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی تربیت بھی ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

اگر والدین اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کریں تو منشیات جیسے مسائل کا آغاز ہی نہیں ہونے پاتا۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشیات کی روک تھام کی پہلی اور سب سے مؤثر دیوار خود گھر اور والدین ہیں۔ ایک مضبوط خاندانی نظام ہی ایک محفوظ معاشرے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

حالیہ عرصے میں پنجاب حکومت کی جانب سے منشیات کے خلاف آگاہی مہم کے تحت ایک اہم پیغام سامنے آیا ہے کہ "منشیات کی روک تھام کے لیے ہمارا ساتھ دیں"۔ یہ جملہ دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ منشیات کے خلاف جنگ صرف حکومت یا کسی ایک ادارے کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے معاشرے کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اگر ریاستی ادارے اپنی سطح پر کارروائی کر رہے ہیں تو عام شہریوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔ شہری سطح پر سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ کسی بھی مشکوک سرگرمی، منشیات کی فروخت یا استعمال کی اطلاع متعلقہ اداروں تک پہنچائی جائے۔ خاموشی اختیار کرنا بالواسطہ طور پر برائی کی حمایت کے مترادف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھنا اور خصوصاً نوجوانوں کی سرگرمیوں سے آگاہ رہنا بھی ایک اہم ذمہ داری ہے۔

معاشرتی سطح پر ہمیں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں منشیات کے استعمال کو سختی سے ناپسند کیا جائے اور اس کے خلاف اجتماعی شعور بیدار ہو۔ اگر کسی فرد کو اس لعنت میں مبتلا دیکھا جائے تو اسے نفرت کی بجائے اصلاح اور مدد کی طرف لایا جائے۔ اسی طرح محلے، تعلیمی اداروں اور سماجی تنظیموں میں آگاہی مہمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا بھی شہری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی برائی کو روکنا اور نیکی کو پھیلانا ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ اس اصول کی روشنی میں منشیات کے خلاف اجتماعی تعاون نہ صرف ایک سماجی ضرورت ہے بلکہ ایک دینی فریضہ بھی ہے۔

ISSN # : 3080-9746

ریچھ کا شکار

محمد ذوالقرنین حیدر

کاغان کی خوب صورت وادی مغربی پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا موسم کشمیر کی طرح نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ علاقے چاروں طرف سے بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، جن میں صاف شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔ اس وادی میں بالاکوٹ کے مقام پر ایک خوبصورت کوٹھی میں احسن کی والد جو محکمہ جنگلات کے افسر تھے، رہا کرتے تھے۔

کاغان کی خوب صورت وادی مغربی پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا موسم کشمیر کی طرح نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ علاقے چاروں طرف سے بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، جن میں صاف شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔ اس وادی میں بالاکوٹ کے مقام پر ایک خوبصورت کوٹھی میں احسن کی والد جو محکمہ جنگلات کے افسر تھے، رہا کرتے تھے۔ احسن اور اس کا چھوٹا بھائی ضیا دونوں گرمیوں کا موسم اپنے والد کے پاس ہی گزارا کرتے۔ ایک روز دونوں بھائی سیر کو نکلے۔ چوں کہ اس علاقے میں جنگلی جانوروں کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے، اس لیے باہر جاتے وقت احسن اپنی شکاری بندوق ہمیشہ ساتھ لے جاتا اور آج بھی بندوق اس کے پاس ہی تھی۔ دونوں بھائی اطمینان سے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ احسن نے ضیا کا بازو پکڑ کر اسے ایک دم ٹھہرا دیا۔

کیا ہے؟ ضیا نے گھبرا کر پوچھا اور پھر احسن کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے اسے خاموش کرنے کے لیے اس کے منہ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا اور پھر فوراً ہی بندوق تان کر سامنے فائر کر دیا، فائر کے ساتھ ہی وہ سڑک کے پار جھاڑیوں کی طرف بھاگا اور ضیا کو بھی اپنے پیچھے پیچھے بھاگنے کو کہا۔ اب ضیا سمجھا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ریچھ کا بچہ لنگڑاتا ہوا بڑے عجیب انداز سے ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ وہ گولی کھا کر زخمی ہو چکا تھا۔

جونہی وہ ان کے قریب آیا، اس نے اپنا منہ اور دونوں پنجے ان پر حملہ کرنے کے لیے اوپر اٹھائے، اس نے بڑھ کر بندوق کا دستہ ان کے منہ پر زور سے دے مارا جس سے اس کے منہ سے خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔ زخمی تو وہ ہی چکا تھا۔ دوسری ضرب کھا کر اور کچھ دیر زمین پر تڑپنے اور شور مچانے کے بعد وہیں ختم ہو گیا۔ احسن نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور ضیا کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا، گویا اس کی زبان سے اپنی بہادری کی تعریف سننا چاہتا ہے۔

اب اسے گھر لے چلیں؟ ضیا نے کہا۔ ہاں ابا جان کو دکھائیں گے۔ اس نے جواب دیا۔ لیکن مجھے تو اس پر رحم آتا ہے تم نے اس بے چارے کو مارا کیوں۔ ضیا نے کہا۔ ”کیوں مارا؟ یہ موذی جانور ہے۔ نہ مارتے تو یہ ہمیں مار ڈالتا، احسن نے مردہ ریچھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ضیا کی طرف دیکھنے لگا لیکن ضیا نے اس کی بات نہ سنی کیوں کہ اس کی توجہ کسی اور طرف چلی گئی تھی۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے کانوں میں کچھ فاصلے پر سے خوفناک قسم کی آواز آ رہی تھی اور اب اس آواز کو دونوں بھائی سن رہے تھے۔ یہ آواز لمحہ بہ لمحہ نزدیک آنے لگی، اچانک احسن نے گھبرا کر ضیا کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔

ریچھ! ریچھ آ گیا۔

گھبراہٹ میں یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے اور سامنے ایک بہت بڑا سیاہ ریچھ نمودار ہوا۔

وہ اپنے خوفناک سر کو زمین کی طرف جھکائے بڑے خطرناک انداز سے آ رہا تھا۔ دونوں بھائیوں پر اس قدر دہشت چھا گئی کہ انہیں کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ بندوق احسن کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اسے اندازہ تھا کہ گولی بھرنے اور نشانہ باندھنے سے پہلے ہی ریچھ اسے آ لے گا۔ وہ بندوق زمین پر پھینک قریب کے ایک درخت پر چڑھ گیا اور ضیا کو بھی فوراً دوسرے درخت پر چڑھنے کی ہدایت کی۔ ریچھ نہایت تیزی سے ادھر ادھر زمین کو سونگھتا ہوا اپنے بچے کے قریب آیا اور اسے چاروں طرف سے ہلا جلا کر سونگھنے لگا۔ ریچھ سونگھ کر معلوم کر لیتا ہے کہ لاش میں جان ہے یا نہیں جب اسے تسلی ہو گئی کہ بچہ مر چکا ہے تو اس نے ایک دردناک چیخ ماری جس سے سارا جنگل ہل گیا اور دونوں بھائیوں کے دل بھی دہل گئے۔ اب وہ لاش کو چھوڑ کر ان دونوں کی طرف لپکا۔ غصے کے مارے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پہلے وہ اس درخت کے قریب آیا جس پر خوفزدہ احسن بیٹھا ہوا تھا۔ ریچھ نے اپنا بھاری سر اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے پنجے درخت پر جما کر اس پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ضیا دور ایک درخت پر بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا اور خوف سے لرز رہا تھا۔ ابھی ریچھ احسن تک پہنچا نہ تھا کہ احسن چھلانگ لگا کر اسی درخت کے ساتھ والی شاخ پر کود گیا۔

ریچھ دوسری شاخ تک نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اب نیچے اتر آیا تا کہ نیچے سے دوسری شاخ کی طرف جا سکے۔ اسی دوران میں ضیا نے اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس نے درخت سے نیچے اتر کر زمین پر پڑی ہوئی بندوق اٹھائی اور گولی بھر کر ریچھ پر نشانہ لگایا۔ ریچھ جو ابھی درخت کے تنے پر ہی چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا زخمی ہو کر ایک دم مڑا اور احسن کو چھوڑ کر ضیا کی طرف دوڑا جواب بندوق پھینک کر دوبارہ درخت پر چڑھ رہا تھا۔

دونوں کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ ریچھ نے اپنا اگلا پنجہ اسے مارا جس سے وہ زخمی ہونے سے تو بچ گیا لیکن اس کی لٹکتی ہوئی قمیض کے ٹکڑے علیحدہ ہو کر ریچھ کے پنجے میں رہ گئے اور ریچھ پھسلتا ہوا زمین پر آ گیا۔ احسن نے دوسرے درخت پر سے بھائی کو آواز دی کہ اور اوپر چڑھ جائے کیوں کہ ریچھ دوبارہ درخت پر چڑھ رہا تھا۔ اب جب احسن کو ضیا کی جان خطرے میں نظر آئی تو وہ درخت پر سے اترا اور ایک گولی ریچھ پر چلا دی۔ ریچھ جو ضیا سے اب چند فٹ کے فاصلے پر تھا، گولی کھاتے ہی دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ اس دوسری گولی کا زخم اتنا کاری ثابت ہوا کہ وہ گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ ضیا نے جو درخت کی بہت اونچی شاخ پر بیٹھا تھا، جب ریچھ کو اس طرح زمین پر گرتے دیکھا تو اس نے خیال کیا کہ شاید ریچھ کو گولی نہیں لگی بلکہ اس نے درخت پر سے احسن پر چھلانگ لگا دی ہے اور اب وہ احسن کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ بھائی کے غم میں اپنے حواس کھو بیٹھا اور غش کھا کر درخت سے نیچے گر پڑا لیکن خوش قسمتی سے وہ مردہ ریچھ کے اوپر گرا جس کے بدن کی کھال اور بڑے بڑے بالوں نے اس کے لیے گدیلے کا کام دیا، جب اسے ہوش آیا تو ریچھ کو مردہ اور بھائی کو زندہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور پھر دونوں بھائی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اب ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دونوں ریچھ اور اس کے بچے کو گھسیٹتے ہوئے گھر لے گئے اور جب دونوں بھائیوں نے سب واقعات گھر والوں کو سنائے تو وہاں کی بہادری پر حیران رہ گئے اور دونوں بھائیوں کی اس محبت کی یادگار کے طور پر ریچھ اور اس کے بچے کی کھال اتروا کر انہوں نے اپنے کمرے کی دیوار پر لٹکا دی۔

ISSN # : 3080-9746

پاکستانی کرکٹ ٹیم کا 10واں دورہ ویسٹ انڈیز۔۔۔۔اُمیدیں اور حقائق

خراب ایمپائرنگ نے کئی مواقع پر پاکستانی ٹیم کی فتح شکست میں بدل دی

جب ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی جیت کے بعد شرمندہ نظر آئے

رپورٹ: محمد عمر

پاکستانی کرکٹ ٹیم رواں ماہ جولائی کے وسط میں ویسٹ انڈیز کا دورہ کررہی ہے جہاں دوٹیسٹ میچوں کی ایک سیریز کھیلی جائے گی، ویسٹ انڈیز کی ٹیم کا ریکارڈ پچھلے کئی سالوں سے بہت خراب رہا ہے اور وہ آسٹریلیا کے خلاف 27 رنز پر بھی آوٹ ہوچکی ہے، دوسری طرف پاکستان کا حال بھی مختلف نہیں جو شان مسعود کی قیادت میں پچھلے 14 میں سے 10 ٹیسٹ ہار چکی ہے، بہرحال پاکستانی ٹیم کے ویسٹ انڈیز کے سابقہ دوروں کا مختصر جائزہ نذر قارئین ہے:

1: پاکستانی کرکٹ ٹیم نے سب سے پہلے 1957 میں عبدالحفیظ کاردار کی قیادت میں ویسٹ انڈیز کا دورہ کیا، ویسٹ انڈیز تیز باولر ویلزلے ہال اور آل راؤنڈر گیری سوبرز کی موجودگی میں دنیا کی خطرناک ترین ٹیم سمجھی جاتی تھی، پاکستانی کرکٹ ٹیم کو ٹیسٹ کھیلتے ہوئے ابھی 5 سال ہی ہوئے تھے مگر اس ٹیم کے کھلاڑی حنیف محمد، فضل محمود، امتیاز احمد، خان محمد کئی میچوں میں یادگار کارکردگی پیش کر چکے تھے، یہ سیریز بڑی یادگار رہی، اس سیریز میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں میں شاید نسیم الغنی اور گیری سوبرز ہی ابھی تک حیات ہیں، ایک کھلاڑی وزیر محمد کا چند ماہ پہلے 96 برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا، پانچ میچوں کی یہ سیریز ویسٹ انڈیز نے 1_3 سے جیت لی، یہ سیریز آج 69 سال بعد بھی پاکستان کی سب سے یادگار سیریز قرار جاتی ہے، اس سیریز کے ایک ٹیسٹ میں حنیف محمد نے 337 رنز بنا کر پاکستان کی طرف سے پہلی ٹرپل سنچری اسکور کی، اس اننگز کے دوران وہ 16 گھنٹے سے زائد وکٹ پر رہے، یہ ریکارڈ 69 سال بعد بھی برقرار ہے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے ایک ٹیسٹ میں اپنے اسپنرز کی بدولت کامیابی حاصل کرکے دنیا کو حیران کردیا۔ ویسٹ انڈیز کے عظیم کھلاڑی گیری سوبرز نے 365 رنز کی اننگز کھیل کر عالمی ریکارڈ قائم کیا، یہ ریکارڈ 1994 تک برقرار رہا جب ویسٹ انڈیز کے ہی کھلاڑی برائن لارا نے 375 رنز بنا کر یہ ریکارڈ توڑ دیا۔ ویسٹ انڈیز کی ایمپائرنگ جانبدارانہ، نہ ہوتی تو شاید نتیجہ مختلف ہوتا، مایہ ناز پاکستانی باولر فضل محمود کے مطابق جس اننگز میں گیری سوبرز نے 365 رنز بنائے، وہ 94 کے انفرادی اسکور پر ان کی گیند پر وکٹ کیپر امتیاز کے ہاتھوں کیچ آوٹ ہوگئے تھے مگر ایمپائر نے آوٹ نہ دیا۔18_2 سال کے طویل وقفہ کے بعد 1976 میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نیو ویسٹ انڈیز کا دوسرا دورہ کیا، مشتاق محمد پاکستانی ٹیم کے کپتان تھے جبکہ ویسٹ انڈیز کی قیادت کلائیو لائیڈ کررہے تھے، پاکستانی ٹیم میں ظہیر عباس، آصف اقبال، ماجد خان، وسیم راجہ، عمران خان اور سرفراز نواز جیسے کھلاڑی موجود تھے جبکہ ویسٹ انڈیز تاریخ کے خطرناک ترین کھلاڑیوں کلائیو لائیڈ، ویوین رچرڈز، گرینج، ڈیسمنڈ ہینز، اینڈی رابرٹس، مائیکل ہولڈنگ، کولن کرافٹ پر مشتمل تھی، پاکستانی ٹیم پہلی مرتبہ آسٹریلیا کو آسٹریلیا میں ٹیسٹ ہرانے کے بعد ویسٹ انڈیز پہنچی تھی، سڈنی ٹیسٹ کے ہیرو عمران خان ایک خطرناک تیز رفتار باولر کے طور پر شناخت حاصل کرچکے تھے۔

پاکستانی ٹیم نے ویسٹ انڈیز کی خطرناک ٹیم جسے کالی آندھی کہا جاتا تھا کے خلاف شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا اس دور میں بھی غیر جانبدار ایمپائر ہوتے تو پاکستانی ٹیم کم از کم سیریز برابر کرلیتی، آخری ٹیسٹ پاکستانی ٹیم تقریباً جیت چکی تھی، ویسٹ انڈیز کے 9 کھلاڑی آوٹ ہوچکے تھے، آخری کھلاڑی کولن کرافٹ کئی مرتبہ آوٹ ہوئے مگر ایمپائر کی مہربانی سے وہ میچ ڈرا کرنے میں کامیاب ہوگئے، ایک ٹیسٹ پاکستان نے جیتا جسے کپتان مشتاق محمد کا میچ کہا جاتا ہے انہوں نے پہلی اننگز میں 121 اور دوسری اننگز میں 56 رنز بنانے کے علاوہ پہلی اننگز میں 5 اور دوسری اننگز میں 3 وکٹ حاصل کئے۔2 ٹیسٹ ویسٹ انڈیز نے اپنے تیز باولرز کی وجہ سے جیت لئے، وسیم راجہ اور ماجد خان کامیاب ترین بلے باز رہے، آصف اقبال نے بھی مشکل حالات میں سنچری بنا کر مین آف دی کرائسس کا اعزاز حاصل کیا، عمران خان نے سیریز میں 25 وکٹ حاصل کئے، ویسٹ انڈیز نے ایمپائرز کی مدد سے 5 میچوں کی سیریز 1_2 سے جیت لی۔_3 پاکستانی ٹیم نے تیسری مرتبہ 1988 میں عمران خان کی قیادت میں ویسٹ انڈیز کا دورہ کیا، پہلے ٹیسٹ میں ویوین رچرڈز کی جگہ گورڈن گرینج نے ویسٹ انڈیز کی قیادت کی، پاکستانی کرکٹ ٹیم نے جاوید میانداد کی شاندار سنچری اور عمران خان کی گیارہ وکٹوں کی بدولت 9 وکٹ سے کامیابی حاصل کرکے یہ فارمولا غلط ثابت کردیا کہ ویسٹ انڈیز کو اس کے ہوم گراونڈ پر شکست نہیں دی جاسکتی۔ دوسرا ٹیسٹ جاوید میانداد کی شاندار سنچری کے باعث پاکستانی ٹیم نے ڈرا کرلیا، پاکستانی ٹیم تیسرا ٹیسٹ جیتنے کے بالکل قریب پہنچ گئی تھی، ویسٹ انڈیز کے 8 وکٹ گر چکے تھے، وکٹ کیپر ڈیوجون اور بنجمن وکٹ پر تھے، بنجمن پاکستانی باولر عبدالقادر کی گیند پر صاف آوٹ ہوکر بھی باہر نہ گئے، ایمپائرز کے غاصبانہ فیصلوں کی وجہ سے ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی اپنی جیت پر بھی شرمندہ نظر آتے تھے۔ بعدازاں ایک انٹرویو میں ڈیوجون نے اعتراف کیا کہ وہ آوٹ ہوگئے تھے لیکن اگر میچ ہار جاتے تو تماشائی انہیں زندہ نہ چھوڑتے۔ اس ٹیسٹ میں ویوین رچرڈز کی سنچری بہترین بیٹنگ کا نمونہ تھی، سیریز میں جاوید میانداد نے دو سنچریاں بنائیں جبکہ عمران خان نے 3 ٹیسٹ میں 21 وکٹ حاصل کئے۔ (جاری ہے)

ISSN # : 3080-9746

برصغیر کے Anti Heroes جنہوں نے ہیروز سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی

کیا Anti Heroes کا سلسلہ شاہ رخ کی ''ڈر'' سے شروع ہوا؟

شاہد کے کیریئر کا آغاز بھی Anti Hero کے طور پر ہوا

بلال عباس ''چیخ'' میں منفی کردار سے ہی سپر سٹار بن گئے

رپورٹ: محمد عمر

فلم ہو یا ٹی وی، ہدایت کار کی کوشش ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے کچھ نیا پیش کیا جائے، عام طور پر فلموں میں نیکی اور بدی کی جنگ دکھائی جاتی ہے، ابتدا میں بدی کی قوتوں کا غلبہ ہوتا ہے، پھر ظلم اور زیادتی کرنے والوں کے خلاف ایک جنگ شروع ہوتی ہے اور آخر کار سچائی کو کامیابی نصیب ہو جاتی ہے، اسی ایک فارمولے پر ہزاروں فلمیں اور ڈرامے پیش کئے جا چکے ہیں، مرکزی خیال اور نتیجہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے، مصنف اور ہدایت کار کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک ہی فارمولے کو اس انداز سے پیش کریں کہ لوگوں کو اس میں کچھ مختلف نظر آئے مثلاً انڈیا کی فلم شعلے میں ولن کے کردار گبھر سنگھ کو اتنا بڑھا چڑھا دیا گیا کہ اس کے سامنے دونوں ہیروز دھرمندر اور امیتابھ بچن ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اسی طرح پاکستانی فلم مولا جٹ میں مصطفیٰ قریشی کا نوری نت کا کردار اتنا پسند کیا گیا کہ تقریباً 50 سال بعد بھی شائقین کو نوری نت بھول نہیں سکا 1992 ، میں مشہور انڈین ہدایت کار یش چوپڑا نے اپنی فلم ،،ڈر،، میں ایک منفی کردار کو ہیرو کے مقابل کھڑا کر دیا تو عامر خان جیسے بڑے اداکار نے اس کردار کو مسترد کر دیا کہ وہ خود پر منفی کردار کی چھاپ نہیں لگوانا چاہتے، یش چوپڑا نے وہ کردار نئے فنکار شاہ رخ سے کرایا تو وہ کردار اتنا پسند کیا گیا کہ شاہ رخ راتوں سپر سٹار بن گئے اور آج 34 سال بعد بھی وہ بالی ووڈ کے King ہیں اور انہیں دلیپ کمار راجیش کھنہ کے بعد بالی ووڈ کا سپر سٹار قرار دیا گیا، بعد ازاں انہوں نے بازی گر اور انجام میں بھی Anti Heroes کے کردار کئے، 1995 میں،، دل والے دلہنیا لے جائینگے،، کی تاریخی کامیابی کے بعد شاہ رخ پر منفی کرداروں کی چھاپ ختم ہو گئی، اگر 1992 میں عامر خان، ڈر،، میں کام کر لیتے تو شاید شاہ رخ کی جگہ آج کوئی اور بالی ووڈ کا کنگ ہوتا۔ نئی نسل کے فلم بین ناواقف ہونگے کہ Anti Hero کا کردار شاہ رخ سے بہت پہلے پاکستانی اداکار شاہد نے بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا، 1971 میں اپنی پہلی فلم ،،انسو،، میں شاہد نے ندیم اور اداکارہ دیبا کے مقابلہ میں Anti Hero کا کردار کر کے خود کو منوالیا تھا اس طرح پاکستانی فلمی صنعت کو ایک خوبصورت ہیرو مل گیا جس نے محمد علی ، ندیم اور وحید مراد کے مقابلہ میں اپنی الگ پہچان بنائی، 70 کی دہائی پاکستانی فلموں کے عروج کا زمانہ تھا اس دور میں تینوں سپر سٹارز کے مقابلہ میں شاہد نے بے شمار گولڈن جوبلی اور

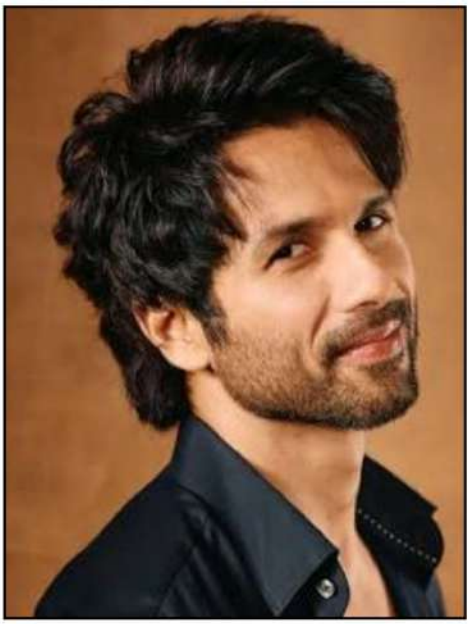

ڈائمنڈ جوبلی فلمیں دیں، جس دور میں شاہد ہیرو کے طور پر خود کو منوا چکے تھے، اس وقت بھی شاہد نے ،،شبانہ،، اور ،،بیگم جان،، میں Anti Heroes کے کردار کئے اور دونوں فلمیں گولڈن جوبلی سے بھی آگے نکل گئیں، شبانہ میں روایتی ہیرو وحید مراد تھے اور تقریباً سارے گیت بھی ان پر فلمائے گئے تھے مگر بہترین اداکاری کا نگار ایوارڈ شاہد کو ملا تھا۔

منی سکرین کی بات کریں تو ڈر میں شاہ رخ کردار کو پاکستانی ٹی وی کے کرداروں نے بھی اچھے طریقے سے نبھایا، ڈرامہ سیریل،، چیخ،، میں بلال عباس نے Anti Hero کا کردار اس انداز سے نبھایا کہ شائقین کو ان میں شاہ رخ کی جھلک نظر آئی، اس ڈرامہ سیریل کے بعد سے ہی بلال عباس کو پاکستان میں چھوٹی سکرین کا سب سے بڑا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ ڈرامہ سیریل ،، بہروپیا،، میں فیصل قریشی نے جو کردار کیا وہ شاید پاکستانی شوبز میں آج تک کوئی نہیں کر سکا،

انہوں نے ایک ہی ڈرامہ سیریل میں سات مختلف کردار کئے، بچپن میں یتیم ہو جانے والا بچہ سوتیلے باپ کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت ایک ایسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ اس پر کبھی کوئی تو کبھی کوئی شخصیت غلبہ حاصل کر لیتی ہے، اس کردار پر فیصل قریشی کو بڑے سے بڑا ایوارڈ ملنا چاہئے تھا، ڈرامہ سیریل ،، ہمراز،، میں پاکستانی فنکار فیروز خان نے بھی ایک منفی کردار کیا جو اپنے بھائی کی موت پر ایک بیقصور لڑکی آئزہ خان کو قاتل سمجھ لیتا ہے اور بھائی کا بدلہ لینے کیلئے اس کے بچے کو پیدائش سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے جس کے بعد اس پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ اس کے بھائی کی موت کا سبب بننے والی لڑکی وہ نہیں بلکہ اس کی ہمنام ایک دوسری لڑکی ہے تو وہ اپنے مظالم پر بہت پچھتاتا ہے۔ اس کردار میں فیروز خان نے یادگار اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ان دنوں مقبول ترین ڈرامہ سیریل ،، بس تیرا ساتھ ہو،، میں حارث اور زویا ناصر کے منفی کردار اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کئے گئے ہیں کہ ان کا عام لوگوں کے درمیان گھومنا پھرنا مشکل ہو گیا ہے اور دونوں فنکار اس بات پر خوش ہیں کہ لوگوں کی نفرت ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنا کام اچھے طریقے سے کر رہے ہیں۔

ISSN # : 3080-9746

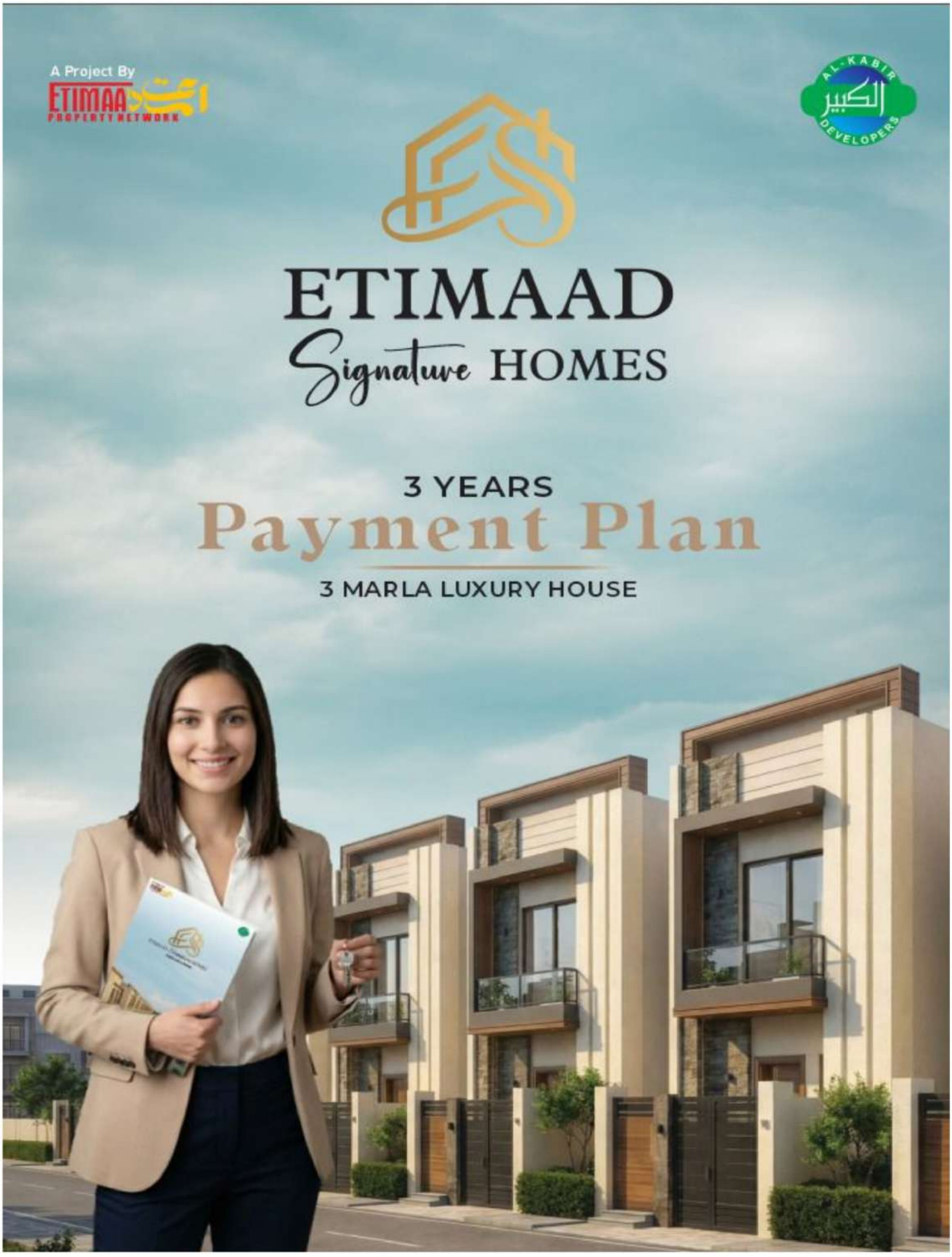

ISSN # : 3080-9746